Scanned with CamScanner

عبد القدوس روحی
۱۲-۱۲-۱۹۷۰

علامہ ابو الاعلیٰ مودودی کی تفسیر پر مبسوط و مفصل تبصرہ

"تفہیم القرآن" سمجھنے کی کوشش

(جلد اوّل)

(تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ سے متعلق)

عبد القدوس رومی مفتی شہر آگرہ

ناشر

صہیب برادرس، صابن کٹرہ، آگرہ ۳

ضروری تفصیلات

کتاب کا نام	"تفہیم القرآن" سمجھنے کی کوشش
مصنف	عبدالقدوس رومی مفتی شہر آگرہ
ناظم اشاعت	شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ ہدایت جے پور
طابع	نیشنل آرٹ پرنٹرس - الہ آباد
ناشر	صہیب برادرس 11/98 صابن کٹرہ - آگرہ
سال اشاعت	رمضان ۱۴۰۰ھ اگست ۱۹۸۰ء
تعداد اشاعت	ایک ہزار

قیمت اٹھارہ روپے	ملنے کے پتے	قیمت Rs 18=

دہلی میں	ہندوستانی کتب خانہ۔ حضرت نظام الدین۔ دہلی
دیوبند میں	مکتبہ نعمانیہ دیوبند
سہارن پور میں	کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارن پور
لکھنؤ میں	کتب خانہ الفرقان نیا گاؤں مغربی لکھنو
آگرہ میں	صہیب برادرس 11/98 صابن کٹرہ - آگرہ ۳

کہاں کیا پڑھیں؟

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

انتساب

اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد سراج الحق صاحب علیہ الرحمہ کے نام

جنھوں نے تفسیر قرآن مجید سے اپنی خصوصی دلچسپی و شغف کے باعث علامہ مودودی سے کسی وقت بوقت ملاقات یہ فرمائش بھی کردی تھی کہ —" اچھا ہوتا اگر آپ کے قلم سے ایک تفسیر اردو میں آجاتی" —— (مولانا دریا بادی نے بھی اپنی آخری کتاب "معاصرین" میں والد محترم رح کے تذکرہ میں یہ اقرار و انکشاف فرمایا ہے کہ موصوف کی انگریزی تفسیر کے محرک اول بھی حضرت والد صاحب مرحوم ہی تھے)۔

کیا عجب کہ والد صاحب مرحوم ہی کی فرمائش نے علامہ مودودی کو بھی تفسیر نگاری پہ آمادہ کردیا ہو اللہ تعالی والد مرحوم کی اس لغزشِ تحریک کو معاف فرمائے جو وہ علامہ سے اپنی بیجا عقیدتمندی کے دور میں کرگذرے جسکے نتیجہ میں موصوف کی یہ تفسیر تفہیم القرآن وجود میں آگئی جو تحریک کو پروان چڑھانے میں موثر و کارگر ثابت ہوئی۔

حضرت والد مرحوم نے "خلافت و ملوکیت" سامنے آنے پر اس فتنہ کی خطرناکی کا احساس فرمالیا تھا چنانچہ اسکی تردید میں "خلافت و ملوکیت کی حقیقت" نامی ایک کتابچہ اور "مولانا مودودی و سیدنا عثمان غنیؓ" نام سے ایک رسالہ تصنیف فرماکر بڑی حد تک اپنی اس بیجا عقیدتمندی کا کفارہ بھی ادا فرمادیا تھا لیکن علامہ کی اس خطرناک تفسیر اور تحریک مودودیت کے بنیادی شاہکار تفہیم القرآن پر کام کرنیکا انھیں موقع نہ مل سکا لہذا ہر آنچہ پدر نتواں کرد پسر تمام کند کے مصداق علامہ کی تفسیر سے پیدا ہونیوالی خطرناکیوں اور زہرناکیوں کے تدارک و استدراک کیلئے یہ تبصرہ لکھا گیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے فضلِ خاص سے اسے قبول فرماکر راقم السطور کیلئے خصوصیات اور حضرت والد مرحوم کیلئے رفع درجات کا ذریعہ بنائے۔ آمین بجاہ النبی الامین

احقر ندوی غفرلہ

تشکرات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

(۱) اللہ رب العزت کی حمد و ستائش کا فریضہ ہی وہ وظیفۂ حیات ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی صورت شاید یہی ہو سکتی ہو کہ اسکی ادائیگی سے اپنے عجز و قصور کا بندگانہ اعتراف کر لیا جائے۔ آخر تو خود حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ فرما کر ہی اپنی حمد و ستائش کو کمال انتہا تک پہونچایا ہے۔

(۲) حضور سرور کائنات فخر موجودات سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر بھی ہزار ہزار اور لاکھ لاکھ درود و سلام بھیجئے مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے باوجود آپکی ممنونیت و احسانمندی اور آپکی غلامی کا حق ادا نہو سکے گا۔

لا یمکن الثناءُ کما کان حقہٗ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(۳) حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل میں درود و سلام ہو حضرات صحابۂ کرام اور آپکی ازواج مطہرات و ذریات طیبات پر کہ یہی حضرات وسیلہ اور واسطہ ہیں جنکے ذریعہ دین برحق کی تعلیمات ہم تک پہنچ سکیں۔

(۴) دین برحق کے ائمہ کرام حضرات مجتہدین و محدثین، ائمہ کلام و عقائد، مشائخ تصوف و سلوک، سادات سلاسل، حضرات مجددین و مصلحین سب ہی کی دینی و علمی خدمات لائق اظہار تشکر ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے رحمت و رضوان کا معاملہ فرمائے۔

(۵) راقم السطور کے جملہ اساتذہ اور مشائخ و اکابر جو حیات ہیں یا رحلت فرما چکے ہیں ان سب کا احسان احقر کی اس ناچیز کوشش میں شامل حال رہا ہے، فجزاھم عنی وعن سائر المسلمین۔

(۶) ایک اہم اور خصوصی شخصیت حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب دامت برکاتہم بانی جامعہ ہدایت جے پور بھی خصوصیت کیساتھ مستحق تشکر ہے موصوف نے جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی جانب سے اسکی اشاعت منظور فرما کر احقر کو مزید ممنون فرمایا۔

رومی غفرلہٗ

عرض مدعا سے پہلے

ایک مدت سے یہ ضرورت محسوس کیجا رہی تھی کہ علامہ ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے اور پوری دیانت کے ساتھ دیکھا جائے کہ علامہ کے وہ افکار و نظریات جو علماء حق کے نزدیک قابل اعتراض اور لائق تردید ہیں موصوف کی اس تفسیر میں تو نہیں سمو دیئے گئے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ پوری دیانت کے ساتھ بغیر کسی تواضع و انکسار اپنا احساس یہ بھی تھا کہ علامہ جیسی بلند قامت اور شہرۂ آفاق شخصیت کی تفسیر کا صحیح طور پر جائزہ لینا یا تبصرہ کرنا اپنے بس کی بات ہرگز نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ایک مدت تک ضرورت کا یہ احساس دل میں کروٹیں ہی لیتا رہا اور بات آرزو و تمنا سے آگے نہ بڑھ سکی ـــــــ یہاں تک کہ ایک روز اسی احساس نے شدت اختیار کی اور دل میں یہ خیال قائم ہو گیا کہ تو اگر علامہ کی تفسیر پر تبصرہ کا اہل نہیں ہے نہ سہی آخر اس میں کیا مضائقہ ہے کہ کم از کم اسکا مطالعہ تو کر لیا جائے شاید مطالعہ سے یہ بات تو صاف ہو جائے کہ علامہ کی یہ تفسیر بالکل بے غبار اور بے ضرر ہے جسکے مطالعہ کا مشورہ دوسروں کو بھی دیا جا سکتا ہے، یا ایسی نہیں ہے اور عام مسلمانوں کو اسکے مطالعہ سے باز رکھنا ضروری ہے ـــــــ اس خیال کی معقولیت کے سامنے اپنی عاجزی نے مانگی ہوئی بھی ہتھیار ڈال دیئے ـــــــ نتیجہ میں دوسرے روز اپنے ایک کرم فرما سے "تفہیم القرآن" کی پہلی جلد مستعار لی اور مطالعہ شروع کر دیا ـــــــ قدرت کو شاید کسی نہ کسی درجہ میں احقر سے بھی یہ کام لینا منظور تھا کہ تفسیر کا دیباچہ و مقدمہ ہی پوری طرح نقد و تبصرہ کا مستحق نظر آنے لگا ـــــــ ہمت پیدا ہو گئی اور اللہ کا نام لیکر تفسیری دیباچہ پر مختصر سا تبصرہ لکھ ڈالا۔

صحیح تاریخ و ماہ تو محفوظ نہیں مگر اندازہ یہ ہے کہ دیباچہ کا یہ تبصرہ ۷۳ء کے اواخر سے پہلے ہی لکھا جا چکا تھا ـــــــ شاید نومبر ۷۳ء میں "نظام جدید" کا نیو رکا پہلا شمارہ سامنے آیا اور

اسکے ساتھ ہی مدیر صاحب کیطرف سے رسالہ کیلئے مضمون کی فرمائش کا خط موصول ہوا۔ جواباً میں مضمون کا وہی ابتدائی حصہ انکیں روانہ کردیا گیا مگر مدیر موصوف اسے اسوقت شایع نہ فرماسکے۔ پھر مئی ۸۰ء میں نظام جدید کا نیوز میں اس مضمون کی پہلی قسط شایع ہوگئی اور مدیر صاحب نے اطلاع دی کہ سلسلہ مضمون جاری رکھا جائے۔ اس اطلاع کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔ اب تفسیری دیباچہ کے بجائے علامہ کا مقدمہ زیر تبصرہ تھا ـــــ جسکے مطالعہ سے علامہ کی خاص تحریری تکنیک کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ موصوف نے دیباچہ و مقدمہ سمیت پوری تفسیر میں اپنے ناظرین کی کس طرح ذہن سازی فرمائی ہے ـــــ اسلئے مجبوراً احقر کو بھی اپنے اس تبصرہ میں موصوف کی اس "تکنیک" اور ان کے بین السطوری مضمرات کو واشگاف اور واضح کرنے کیلئے کسی قدر تطویل سے کام لینا پڑ گیا کہ موصوف کی "صحافتی چابکدستی" اور انکے بین السطوری مضمرات کی صحیح نقاب کشائی احقر جیسے غیر منشی کیلئے ممکن نہ تھی۔

تطویل کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ مضمون قسط وار شایع ہو رہا تھا بعض مقامات پر گذشتہ مضمون کا حوالہ دینے اور ربط قائم رکھنے کیلئے بھی تطویل ناگزیر تھی۔

زیر نظر کتاب کی ابتدائی چند قسطیں "الجمعیۃ" سنڈے ایڈیشن میں بھی شایع ہوگئیں جس کے باعث مضمون پڑھنے والوں کا حلقہ کافی بڑھ گیا اور کتابی شکل میں اشاعت کیلئے پیہم اصرار و تقاضے ہونے شروع ہوگئے جسکی وجہ سے سر دست یہ مضمون جوں کا توں کسی نظر ثانی کے بغیر کتابی شکل میں شایع کیا جارہا ہے خدا کرے یہ "اصل تفسیر" کے لئے موجب اصلاح اور احقر کیلئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہو۔ آمین

اپنے انسان (خطا و نسیان سے مرکب) ہونیکا بھی اقرار ہے اور تہی مایہ اور بے علم ہونے کا بھی اعتراف ہے جو حضرات اہل علم اسمیں کوئی فروگذاشت سہو و خطا ملاحظہ فرمائیں متنبہ فرماکر جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

عبدالقدوس رومی ۔ ۲۰ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ ۲۶ جنوری ۸۱ء

Scanned with CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ دیباچہ سے متعلق

تفہیم القرآن کیوں؟

اردو زبان میں متعدد مشہور و معروف اور مقبول و عام پسند تراجم و تفاسیر کے ہوتے ہوئے کسی نئے ترجمہ و تفسیر کی ضرورت بظاہر سمجھ میں نہیں آسکتی تھی چنانچہ خود مودودی صاحب جیسے معقولیت پسند بزرگ بھی اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز نہ فرما سکے اور تفہیم القرآن کے دیباچہ میں اس سوال کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ زیر نظر حصۂ مضمون میں موصوف کے اسی جواب کا تجزیہ و تبصرہ مدنظر ہے۔ موصوف فرماتے ہیں

"میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھتی جا رہی ہے وہ دوسرے مترجمین و مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اسکے ساتھ یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کیلئے کچھ خدمت میں بھی کر سکتا ہوں" (دیباچہ تفہیم ص)

ایک تیر سے دو شکار اور بیک کرشمہ دو کار

علامہ مودودی کی مندرجہ بالا عبارت پوری صراحت و وضاحت کے ساتھ "ایک تیر سے دو شکار" اور "بیک کرشمہ دو کار" کا بہترین نمونہ ہے اور کسی مزید تبصرہ کی محتاج نہیں ہے۔ عبارت بالا کے آخری خط کشیدہ فقروں پر اگر ذرا بھی غور فرمایا جائے تو ان کے بین السطور موصوف کی "ماتحت الشعور تعلی" آسانی سے پڑھی جا سکتی ہے کہ موصوف نے کیسے معصوم انداز میں دوسرے مترجمین و مفسرین کی "قابل قدر مساعی" کی بظاہر قدر افزائی فرماتے ہوئے سب کو تشنہ اور ناقابل تشفی قرار دیکر انکی ناقدری بھی فرمادی ہے، اور اپنی تعریف وتحسین کے اس "غازہ" پر طنز و تعریض کا پانی بھی کس صفائی سے پھیر دیا ہے اور کس فراخ حوصلگی و بلند ہمتی سے کام لیتے ہوئے "ہیچمدانی" کا ادانیٰ سا اشارہ کئے بغیر "بقلم خود" اپنی اہلیت و صلاحیت کا دعویٰ بھی سپرد قلم فرما دیا ہے۔

اس انداز تحریر پر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا ہم اپنے دل کو سمجھا لیتے کہ یہ "ادعائے اہلیت" نہیں ہے صرف "تحدیث بالنعمۃ" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آں موصوف کو صحافت کی ایسی گوناگوں صلاحیتیں بخشی ہیں تو انھیں خدا تعالیٰ کے اس نعمت کے اظہار سے روکنے والے ہم کون ہوتے ہیں؟ لیکن ہم کیا کریں ہماری سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اس تفسیری دیباچہ کا سیاق کلام اور سلسلہ عبارت ہمیں اس "حسن ظن" اور "خوش فہمی" کی مطلق اجازت نہیں دیتا جیسا کہ آئندہ سطور میں تفصیل سے عرض کیا جا رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک انکشاف

علامہ کے اس "دیباچہ تفہیم" سے یہ ایک نیا انکشاف سامنے آتا ہے کہ موصوف کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے علاوہ سارے ہی تراجم "لفظی ہیں" چنانچہ علامہ نے اسی سلسلہ میں اگلے ہی صفحہ پر ایک ذیلی اور بغلی سرخی یوں قائم فرمائی ہے:-

"چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلق" ——— اس سرخی کے تحت ارشاد فرماتے ہیں ——— "میں نے اس کتاب (تفہیم القرآن) میں ترجمہ کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک "ترجمۂ قرآن" کا تعلق ہے یہ خدمت اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقے پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے فارسی میں شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ اور اردو میں شاہ عبدالقادر صاحب شاہ رفیع الدین صاحب۔ مولانا محمود الحسن صاحب۔ مولانا اشرف علی صاحب اور فتح محمد صاحب کے تراجم ان اغراض کو بخوبی پورا کرتے ہیں جن کے لئے ایک "لفظی ترجمہ" درکار ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو "لفظی ترجمے" سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں، انھیں کو میں نے "ترجمانی" کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے" دیباچہ ص۶"

جملہ تراجم و تفاسیر پر خطِ نسخ و بطلان کیوں؟

حقیقت یہ ہے کہ علامہ مودودی جو تمام "امت مسلمہ" کے "اسلام" کو

نظرانداز فرماکر صرف اپنی امت کو "جماعت اسلامی" کا لقب مرحمت فرمارہے ہیں وہ
اس حقیقت سے بھی اچھی طرح باخبر تھے اور ہیں کہ جب تک جملہ قدیم "تراجم و
تفاسیر پر خط نسخ و بطلان" نہ کھینچ دیا جائے گا خود آنموصوف کا شمول زمرۂ مفسرین
میں اور انکی تفہیم کا شمار اردو تفسیروں میں معرض اعتراض اور مورد ایراد ہی رہے گا
اسلئے انھوں نے اپنی مفسرانہ صلاحیتوں کو بروے کار لانے سے پہلے ہی یہ ضروری
سمجھا کہ وہ اپنے تفسیری دیباچہ میں جملہ قدیم تراجم و تفاسیر کو مختلف تنقیدی پہلوؤں سے
مجروح کرنے کا فریضہ بھی خود ہی انجام دے لیں کہ عام لوگوں کے نزدیک وہ تراجم
قابلِ اعتنا اور لائق استفادہ ہی نہ رہ جائیں۔ اسی عظیم مقصد کے لئے موصوف نے
تقریباً سارے ہی تراجم و تفاسیر کو اپنی جرح و تنقید کا نشانہ بنا ڈالا بلکہ بعض حضرات
مفسرین و مترجمین پر تو یہ ظلم بھی روا رکھا کہ اپنی تحریر کردہ مذکورہ بالا فہرست میں نہ تو ان
مترجمین ہی کا ذکر فرمایا نہ انکی خدمت ترجمہ و تفسیر کا تذکرہ ہی ضروری سمجھا مثلاً مولانا عبدالحق
حقانی کی تفسیر و ترجمہ کو یکسر نظرانداز فرماگئے اسی طرح مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی
کے ترجمۂ قرآن کو بھی لائق ذکر نہ سمجھا پھر جن تراجم کا ذکر بھی کیا تو اس پر حکمت اور فنکارانہ
انداز سے کہ ان سب کو "لفظی ترجمہ" کا مصداق قرار دیکر بالکل ہی غیر مفید اور ناقابلِ توجہ
ٹھہرادیا حالانکہ ہر وہ مسلمان جو قرآن پاک کے تراجم سے دلچسپی اور دینی مطالعہ کی بدولت
ان سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوگا کہ موصوف
کی دی ہوئی فہرست تراجم میں صرف حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ تو ایسا
ضرور ہے کہ جس پر "لفظی ترجمہ" کی پھبتی اور "ریمارک" کو برمحل کہا جا سکتا ہے ورنہ موصوف
کے ذکر فرمائے ہوئے بقیہ دوسرے تراجم ہرگز ہرگز ایسے نہیں ہیں جنھیں "لفظی ترجمہ" کا

مصداق قرار دیکر غیر مفید ٹھہرا دیا جائے اور ردی کی ٹوکری میں ڈالدیا جائے۔ لیکن علامۂ زماں فہامۂ دوراں جناب مودودی صاحب کا دعویٰ یہی ہے کہ ان کی تفہیم کے سوا جتنے بھی تراجم ہیں وہ صرف لفظی ہیں اور گوناگوں خرابیوں پر مشتمل ہیں جنکی تفصیل علامہ نے اپنے اسی دیباچہ تفہیم میں پیش کی ہے اور ہم بھی زیر نظر تبصرہ میں اسکا مکمل جائزہ اور تجزیہ پیش کرنے جارہے ہیں جس سے ناظرین کو اچھی طرح اندازہ ہوجائے گا کہ علامہ کا یہ دیباچہ صحیح معنوں میں "ایک تیر سے دو شکار" کا مصداق ہے۔

دیباچہ تفہیم کے مندرجہ بالا اقتباس میں علامہ مودودی نے دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کے تراجم کے مقابلہ میں اپنی نام نہاد تفہیم قرآنی کو "ترجمانی" یا آزاد ترجمانی کا نام دیا ہے اور اسکی فوقیت و برتری میں خوب خوب رطب اللساں ہوئے ہیں۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علامہ کی اس ترجمانی کی چھپی ہوئی خوبیوں کا صحیح جائزہ لینے کے لئے اردو کے چند دوسرے تراجم کے ساتھ ساتھ موصوف کی ترجمانی کو بھی باہمی موازنہ اور تقابلی مطالعہ کے لئے بطور نمونہ پہلو بہ پہلو پیش کرکے دیکھیں تو سہی کہ علامہ موصوف کا یہ ادعائے کمال و برتری کہاں تک حقیقت سے بھی ہمکنار ہوتا ہے۔ اسی غرض کے تحت آئندہ سطور میں ایک نقشۂ تراجم پیش کیا جارہا ہے۔ ناظرین کرام بغور ملاحظہ فرماکر خود ہی فیصلہ فرمالیں گے کہ آخر علامہ کی ترجمانی سے پہلے کے دوسرے قدیم تراجم کس لحاظ سے تشنہ و ناقص تھے اور کس راہ سے قرآن فہمی میں حائل تھے کہ علامہ نے ان تراجم کو اپنی جراحت نیز تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا ہے اور اکابر علماء کے ان مستند و معتبر تراجم کا وزن کیسے پرفن انداز میں کم کرنے کی کوشش کی ہے؟

(نقشۂ تراجم اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

Scanned with CamScanner

نقشہ تراجم مشہورہ برائے تقابلی مطالعہ

متن قرآن مجید :-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥ الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ٥ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ٥ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ٥ؕ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥

ترجمہ حقانی :-

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
الم (۱) یہ کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں ۔ پرہیزگاروں کے لیئے ہدایت ہے ۔ متقی وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز اور کچھ ہمارے دیئے میں سے خرچ کرتے ہیں ۔ اور متقی وہ ہیں جو تجھ پر (اے محمد) نازل ہوا اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل کیا گیا اس پر ایمان لاتے ہیں اور قیامت کا یقین کرتے ہیں ۔ وہی متقی لوگ اپنے خدا کی طرف سے بڑی ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں ۔

Scanned with CamScanner

ترجمہ شیخ الہند :-

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الم ہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں ۔ راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو، جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔ اور وہ لوگ ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں ۔ وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہونچنے والے ۔

ترجمہ تھانوی :-

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

الم ہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ۔ راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز اور جو کچھ دیا ہے ہم نے انکو اسمیں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں، اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں ۔ بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب ۔

Scanned with CamScanner

ترجمہ جالندھری :-

شروع نام خدا کا لیکر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ الم ٥ یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کلام خدا ہے) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انکو عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو کتاب (اے محمد) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

ترجمہ عاشقی :-

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے۔ الم ٥ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ رہنما ہے پرہیزگاروں کیواسطے جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور درست رکھتے ہیں نماز کو اور اس میں سے کہ جو ہم نے دیا ہے خرچ کرتے ہیں، اور جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو (اے محمد) نازل کی گئی تمہاری طرف اور جو نازل گئیں تم سے پہلے۔ اور وہ آخرت کا یقین بھی رکھتے ہیں اور یہی لوگ اپنے پروردگار کے راستہ پر ہیں اور یہی مراد پانے والے ہیں۔

ترجمہ مودودی :-

اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔ الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی

کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لئے جو
غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے انکو دیا ہے اسمیں
سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں
تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین
رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی فلاح
پانے والے ہیں۔

تراجم پنجگانہ اور ترجمانی مودودی ـــــ مختصر جائزہ و تجزیہ

سورۂ بقر کی چند ابتدائی آیات کے متعدد و مختلف تراجم کے ساتھ علامہ
مودودی کی ترجمانی بھی بطور نمونہ ملاحظہ ہیں آپ کی اس موقع پر حروف مقطعات کے
سلسلہ میں دیگر حضرات مترجمین نے جو حاشیے تحریر فرمائے ہیں علامہ کے تفسیری حاشیے
کے ساتھ ان حضرات کے حواشی کا بھی ایک نقشہ تقابلی مطالعہ کیلئے انشاء اللہ تعالیٰ
آئندہ اپنے موقع پر پیش کیا جائے گا سر دست تو مختصر طور پر تجزیہ کر کے صرف یہ ظاہر کرنا
مقصود ہے کہ علامہ مودودی کی یہ "ترجمانی" دوسرے قدیم تراجم کے مقابلہ میں
کوئی فوقیت و برتری تو کیا رکھتی صحیح معنوں میں اسے اسکے برابر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

سب سے پہلے بسم اللہ ہی غلط

نمونۃً پیش کیے گئے جملہ تراجم کے ساتھ علامہ کی "ترجمانی" پر غور فرمایا جائے

تو علامہ کی ترجمانی میں سب سے پہلی چیز جو آپ کو اپنی جگہ متوجہ کریگی وہ علامہ کی ایک ایسی "اُپج" ہے جسے محاورہ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انکی تو "بسم اللہ ہی غلط ہوگئی"

علامہ نے جملہ مترجمین سے اختلاف کرتے ہوئے شوق اجتہاد میں "تسمیہ" کا ترجمہ ایک نئے ڈھنگ سے فرمایا ہے۔ ہر ایک مترجم نے عربی قاعدۂ نحویہ کے مطابق "بسم اللہ کی با کا متعلق محذوف مانتے ہوئے ترجمہ میں اسکو ملحوظ رکھا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آغاز تلاوت میں بسم اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام سے تلاوت و قرأت شروع کیجا رہی ہے لیکن موصوف نے اپنی "ترجمانی" میں "شروع" کا ذکر نظر انداز فرما دیا جس کے باعث ابہام باقی رہ گیا کہ آخر اللہ کے نام سے کیا ہو رہا ہے تلاوت شروع ہو رہی ہے یا ختم ہو رہی ہے؟ گویا موصوف نے جملہ "قدیم تراجم" کی خامیاں دور کرنے کے لئے بطور تکمیل جو "ترجمانی" فرمائی ہے تو اس سے تکمیل تو کیا ہوتی ترجمہ میں مزید خلا اور جھول پیدا ہو گیا ایسی صورت میں اگر کوئی کہنے والا چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ لیجئے "علامہ کی تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی"

قابل غور پہلو

علامہ کے سلسلہ میں معاملہ کا قابل غور پہلو یہ ہے کہ موصوف کو "پیروی سلف" اور تقلید اکابر سے کتنا بیر ہے کہ موصوف نے شوقِ جدت طرازی اور ذوقِ اجتہاد فرمائی میں مبہم اور ناقص ترجمانی کو تو اختیار فرما لیا لیکن پیروی سلف اور تقلید اکابر کا دھبہ اپنے دامن پر نہ آنے دیا۔

کلام الٰہی میں اصلاح کا شوق

Scanned with CamScanner

سورۂ بقرہ کی ان منقولہ بالا آیات اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے جو سلسلۂ کلام شروع ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے کئی جملوں پر مشتمل ہے جو "متقین" کی تعیین و تعریف کے طور پر لائے گئے ہیں ان جملوں کے مابین متعدد بار واو عاطفہ بھی مستعمل ہوا ہے دوسرے مترجمین نے اس موقع پر "نظم قرآنی" کو اپنی حالت پر باقی رکھنا ضروری سمجھا ہے اور واؤ عطف کا ترجمہ بھی بار بار کیا ہے لیکن علامہ کا شوق اجتہاد اور ذوق اصلاح اسی صورت میں پورا ہو سکا جبکہ انھوں نے دوسرے مترجمین کے ترجموں سے اختلاف کے ساتھ ساتھ اصلی کلام الٰہی کو بھی اپنی اصلاح سے آراستہ فرمایا ہے اور اپنی دانست میں اپنی ترجمانی کو دوسرے تراجم کے مقابلہ میں نہایت درجہ مہذب اور شستہ و شائستہ بنا دیا ہے یعنی ان آیات میں آئے ہوئے واؤ عطف کو شاید خلاف فصاحت گردانتے ہوئے اپنی فصیح و بلیغ ترجمانی میں مخل سمجھا اور نہ آنے دیا اس طرح تین بار آئے ہوئے واؤ عطف کا ترجمہ صاف اڑا ہی گئے۔

شاید آپ بھی حیران ہونگے

علامہ کی آزاد ترجمانی کے بالمقابل پانچ مشہور تراجم (جو بقول علامہ لفظی ترجمے ہیں) آپ نے ملاحظہ فرمائے میرے خیال میں شاید میری طرح آپ بھی حیران ہوں گے کہ واقعی اگر بقول علامہ ان اکابر کے یہ تراجم بھی لفظی ہی ہیں تو پھر "سلیس" و "مطلب خیز" ترجمہ کا مصداق صرف علامہ کی آزاد ترجمانی ہی کس طرح ہو سکتی ہے۔ اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے موصوف کی اس آزاد ترجمانی کا مفہوم و مطلب بھی متعین کریں کہ "آزاد ترجمانی" سے موصوف کا مدعا کیا ہے اور یہ کہ وہ "ترجمہ" اور "ترجمانی"

Scanned with CamScanner

میں کیا فرق تصور فرماتے ہیں؟

علامہ موصوف نے اپنے تفسیری دیباچہ میں جگہ جگہ اپنے ترجمہ کے لئے "ترجمانی" یا "آزاد ترجمانی" کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور اسکے بالمقابل دوسرے تراجم کیلئے "لفظی ترجمہ" کا فقرہ تحریر فرمایا ہے اس سے بظاہر اندازہ تو یہی ہوتا ہے کہ "آزاد ترجمانی" سے موصوف کی مراد یہی ہے کہ قرآن مجید کے لفظی ترجمہ کی بجائے سلیس اور معنی نیز مفہوم لکھا جائے لیکن اس صورت میں وہی قباحت ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ ایسے "لفظی ترجمہ" کا واقعی حقیقی مصداق تو حضرت شاہ رفیع الدین صاحب ہی کا ترجمہ ہو سکتا ہے بقیہ دوسرے حضرات کے تراجم یقیناً ایسے نہیں ہیں کہ انھیں "لفظی ترجمہ" کا تنقیدی ریاک دیکر ان پر خط نسخ کھینچ دیا جائے مگر ہمارے علامہ کو نہ صرف اصرار بلکہ بیجا طور پر اصرار ہے کہ انکی ترجمانی کے ماسوا سارے تراجم سوختنی اور قلم زدنی ہیں۔

دوسرے تراجم معیار ترجمانی پر کیوں پورے نہیں اترتے

علامہ اپنے اسی دیباچہ میں دوسرے تراجم پر تنقید فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"پہلی چیز جو ایک "لفظی ترجمہ" کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیٔ عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھکر نہ روح وجد میں آتی ہے نہ اسکے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ اسطرح کا کوئی

تاثر رونما ہوتا تو درکنار ترجمہ کو پڑھتے وقت بسا اوقات آدمی یہ سوچتا
رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی کتاب ہے جسکی نظیر لانے کو دنیا بھر کو چیلنج
دیا گیا تھا؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ "لفظی ترجمہ" کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزا
ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ
جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ ترجمے میں شامل
نہیں ہونے پاتا وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے" (ف)

اس مقام پر علامہ مودودی نے دیگر تراجم قرآن کا "آپریشن" جس چابکدستی اور
ہوشیاری سے فرمایا ہے اسکی داد نہیں دی جاسکتی۔ کس صفائی سے موصوف یہ فرما گئے
ہیں کہ "لفظی ترجمہ" کی چھلنی دوا کے خشک اجزا ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے"
"لفظی ترجمہ" کا مصداق اوپر ظاہر ہی کیا جا چکا ہے کہ موصوف کے نزدیک انکی اپنی "ترجمانی
و تفہیم کے ماسوا ہر ترجمہ لفظی ہے۔ اب یہاں یہ بھی انکشاف ہوگیا کہ لفظی ترجمہ قرآن کی
تیز و تند اسپرٹ کو حاصل کرنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ نے اسی "اسپرٹ"
کو اپنی "مینائے" ترجمانی " کے ذریعہ ناظرین تک پہونچانے کی کوشش کی ہے اب یہ فیصلہ
ناظرین کو کرنا ہے کہ مندرجہ نقشہ تراجم میں انھیں اس تیز و تند اسپرٹ کا کچھ فرق محسوس
بھی ہوا یا نہیں؟

علاوہ ازیں یہ بات بھی تشنۂ توضیح رہی کہ علامہ ان سطور مذکورہ بالا میں صرف
"لفظی تراجم" ہی کے نقائص بیان فرما رہے ہیں یا اپنی "ترجمانی" کے ماسوا تمام تراجم کا
"آپریشن" فرما رہے ہیں؟

بہر دو صورت موصوف کا یہ انداز نگارش کسی طرح معتدل اور قرین انصاف

نہ کہا جائے گا کیونکہ موصوف کی اس تنقید کی روشنی میں دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کی (بقول علامہ) قابل قدر مساعی اور ان کے جملہ تراجم کے متعلق بھی یہی فیصلہ ہوگا کہ وہ تمام تراجم روانیٔ عبارت، زور بیان، بلاغت زبان، اور تاثیر کلام سے یکسر خالی ہیں اور انکی عبارت ایسی بے جان ہیں جنھیں پڑھکر نہ آدمی کی روح وجد میں آتی ہے نہ ہی اسکے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں کیونکہ وہ تراجم ہماری دوائے روح کے صرف خشک اجزا ہی پر مشتمل ہیں اور ادب کی وہ تند و تیز اسپرٹ جو اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ ترجمہ میں شامل نہیں ہو سکا بلکہ وہ تو لفظی ترجمہ کی چھلنی کے اوپر ہی اوپر اڑکر غائب ہوگئی ہے۔

کیسے یقین کیا جائے

علامہ کے تیر و نشتر جیسے یہ جراحت خیز فقرے میں نے اپنی عبارت میں صرف اسلئے شامل کر لئے کہ ان فقروں کی بلیغ زہرناکی ناظرین کرام کو اچھی طرح محسوس و محفوظ ہو جائے۔

بہت ممکن ہے بعض ناظرین کو یقین نہ آئے لیکن انھیں یقین کرنا ہی پڑے گا کہ یہ انداز تبصرہ اس "شرذمہ" کے سربراہ کا ہے جو دوسروں کو ہر کام میں "مثبت انداز" اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کیا اس سراپا نشتر و جراحت تبصرہ کے بعد دوسرے حضرات علماء کی "مساعی ترجمہ" محض تضییع اوقات کا مصداق ہوکر نہیں رہ جاتیں۔ سابق مترجمین و مفسرین کی خدمت میں "قابل قدر مساعی" کا تحسینی فقرہ بطور خراج تحسین پیش فرما کر پھر انکی شان میں ایسی "بلیغ ہجو ملیح" کا نذرانہ کھلی پیش کر دینا کمال صحافت نہیں تو اور کیا ہے؟

سچ پوچھئے تو دیباچہ تفہیم کا یہ حصہ اسقدر پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے کہ اسکو پڑھکر کسی نتیجہ پر پہنچنا سخت مشکل ہے۔ علامہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اردو میں اتنے مختلف النوع کثیر التعداد سلیس و مطلب خیز، مقبول و مشہور تراجم و تفاسیر کے ہوتے ہوئے اپنی آزاد ترجمانی کیلئے کوئی معقول وجہ جواز ظاہر کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر وہ کامیابی آسانی سے ہاتھ لگتی نظر نہیں آتی اسلئے وہ بالکل اندھیرے میں "ٹامک ٹوئیاں" جیسی حالت و کیفیت میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تنقید میں کبھی تو قرآن مجید کے "لفظی ترجمہ" کو ہدف اعتراض بناتے ہیں اور کبھی ترجمہ کے بین السطور لکھے جانے کو ساری خرابیوں کی جڑ بتانے لگتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ذرا آگے چل کر یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

" لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کئے جاتے ہیں یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اسکا نقصان یہ ہے کہ آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے اس طرح نہ تو وہ ترجمۂ قرآن کو مسلسل پڑھ سکتا ہے نہ ان سے اثر قبول کر سکتا ہے کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اسکے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ (دیباچہ تفہیم ص)

گذشتہ صفحات میں دیباچہ کا جو اقتباس پیش کیا جا چکا ہے اسمیں علامہ نے "لفظی ترجمہ" کی خرابی یہ ارشاد فرمائی تھی کہ "لفظی ترجمہ کی چھلنی سے دوا کے خشک اجزار ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ روانیٔ عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام

نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہوتی وغیرہ وغیرہ۔ اب اس موقع پہ علامہ کا اعتراض اس مذکورہ بالا پہلو سے قطع نظر کرتے ہوئے اس دوسرے پہلو سے ہو رہا ہے کہ "بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اسکے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو خود بھی شاید اپنی ترجمانی کے دوران یہ تجربہ ہو گیا کہ قرآن مجید کی وہ تیز و تند اسپرٹ جس کے فقدان کی شکایت وہ دوسرے تراجم میں فرما رہے ہیں وہ تو اسی کلام معجز نظام کے ساتھ مخصوص ہے جس کے لئے فصحائے عرب کا اعتراف عجز و قصور یوں نقل فرمایا گیا ہے "ماھذا کلام البشر" یہ تو کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

اس کلام الٰہی کے علاوہ بھی کسی انسانی کلام و عبارت کے متعلق یہ سوچنا بھی بڑی جسارت ہوگی کہ اسکو پڑھکر کوئی انسانی روح اسطرح وجد میں آنے لگے گی یا اس سے رونگٹے کھڑے ہونے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگیں گے جسطرح اصل کلام خداوندی سے ہو جایا کرتے تھے۔

جب حقیقت امر یہ ہوئی تو تعجب ہے علامہ مودودی کی اس جسارت پہ کہ انھوں نے کس طرح اصل کلام الٰہی جیسی تاثیر کی توقع کسی بھی انسانی تحریر سے وابستہ فرمائی کہ جب وہ تاثیر انکیں نہ مل سکی تو اسبات کو وہ ان بیچارے مترجمین کا عیب و نقص قرار دے رہے ہیں کہ انکے تراجم میں وہ خوبیاں و روانیٔ عبارت وغیرہ نہیں ہیں جو اصل کلام الٰہی میں پائی جاتی ہیں

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ مودودی اس جسارت کے مرتکب ہوتے ہوئے "اپنی ترجمانی" کی حسن تاثیر اور زور بیان کے متعلق اس حد تک "خوش فہمی" میں مبتلا ہو گئے

ہونگے کہ وہ اپنی ترجمانی کو اصل کلام الٰہی کا بدل کلی سمجھنے لگیں گے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ موصوف نے دوسرے تراجم کے "آپریشن" میں "نوکِ قلم" کی جراحت کا دیوں کا جو مظاہرہ فرمایا ہے اسکے پیش نظر کسی کا یہ گمان بدگمانی تو نہ قرار دیا جاسکے گا کہ آنموصوف اپنی آزاد ترجمانی کے متعلق کسی نہ کسی حد تک اصل کلام الٰہی جیسی اس روانیٔ عبارت زورِ بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیر کلام کے مدعی ضرور ہیں جس کے نقدان کی شکایت وہ سابقہ جملہ تراجم میں فرما چکے ہیں اور یہ یقیناً بہت بڑی جسارت ہے جسے بَل اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی علم ہی کہا جاسکتا ہے۔

تنقید کا ایک اور پہلو

علامہ مودودی اپنی نئی اور انوکھی تفسیر بلکہ "آزاد ترجمانی" کو مارکیٹ میں لانے کیلئے کسی معقول وجہ جواز کی تلاش میں سرگرداں و پریشان ہیں کبھی کوئی بات فرماتے ہیں تو کبھی کچھ فرماتے ہیں مگر بات بنائے نہیں بن رہی ہے، سیجئے! سب سے آخر میں علامہ بڑی دور کی کوڑی لے آئے اور سب سے بڑی اور اہم وجہ بھی بیان فرمادی۔ ملاحظہ ہو ارشاد فرماتے ہیں:۔

> "ایک اور وجہ اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمہ کے غیر موثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریری زبان کو تحریری زبان میں نہ تبدیل کیا جائے اور جوں کا توں اسکا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے" (دیباچہ تفہیم)

اس موقع پر علامہ نے قرآن مجید کے طرز بیان سے متعلق "تقریری" یا "تحریری" ہونے کا جو نکتہ پیدا فرمایا ہے اسکی "داد" نہ دینا یقیناً "بیداد" کہلائیگا اسلئے اس نکتہ کی داد تو ضرور دی جائیگی، لیکن سردست اس بحث کو تو یہاں ملتوی ہی رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسکا بہترین موقع وہاں ہوگا جہاں علامہ نے اپنے مقدمۂ تفہیم میں قرآن مجید کے تقریری ہونے کی بحث چھیڑی ہے اس موقع پر ہی ہم علامہ کے اس "نکتۂ عجیب" کا خاطر خواہ جائزہ لیں گے۔

علامہ کا شہب خامہ یا فرسِ شطرنج

دیباچہ تفہیم پر کلام ختم کرتے کرتے ناظرین کو علامہ کے کمال صحافت کی جانب بھی متوجہ کرنا چاہونگا کہ ذرا اس پر بھی غور فرمایا جائے کہ علامہ کا "شہب خامہ" شاید "فرس شطرنج" ہے کہ حسب موقع و ضرورت دوہری چال چل لیتا ہے۔ علامہ نے ایک طرف تو دیباچہ کی ابتدائی سطور میں دوسرے حضرات مترجمین کی خدمت میں مدح و تحسین کا کیسا خراج پیش فرمایا تھا (مثلاً ان حضرات کی مساعیٔ ترجمہ کو قابل قدر قرار دیا یا یوں فرمایا کہ یہ خدمت ترجمہ اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقہ پر انجام دے چکے ہیں وغیرہ وغیرہ) اور اب دوسری طرف جب اپنی "آزاد ترجمانی" کے لئے معقول وجہ جواز پیش کرنے کی نوبت آئی تو وہی قابل قدر ترجمے عیبوں کا پشتارہ اور خامیوں کا پلندہ بن گئے اور انھیں تراجم کے ایسے ایسے "آپریشن" اپنے نوک قلم سے فرما دیئے جیسے وہ قابل قدر ترجمے اب صرف "قلم زدنی" ہی ہوگئے ہوں اور ان میں کا کوئی ترجمہ کارآمد و لائق استفادہ و قابل مطالعہ باقی ہی نہ گیا ہو۔

ہمیں کہنا یہ ہے

علامہ مودودی کو اپنے مشن اور اپنی تحریک مودودیت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے تفہیم القرآن لکھنی تھی وہ ضرور لکھتے انھیں طریقہ سلف اہلسنت کو چھوڑ کر راہ تشیع و اعتزال اختیار کرتے ہوئے آزاد ترجمانی کرنی تھی وہ اچھی طرح جی کھول کر فرماتے انھیں انکے اس اقدام سے روکنے والے بھلا ہم کون تھے ؟ لیکن آخر اسکی ضرورت کیا تھی کہ وہ اپنی "تفہیم" سے پہلے کی ساری قابل قدر مساعی (خدمات ترجمہ و تفسیر) پر اسطرح پانی بھی پھیر دیں اور ان پر خط نسخ و بطلان بھی کھینچ دیں۔

ہم کو موصوف سے ایسی کچھ خوش فہمی یا بدگمانی بھی نہیں ہے کہ ہم یہ خیال کر لیں کہ علامہ کو اپنی نوک قلم کی نشتریت اور جراحت کاری کا اندازہ ہی نہ ہوگا وہ بالکل بے خیالی میں یہ سب کچھ فرما گئے ہونگے۔

ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ موصوف نے اپنے دیباچہ تفہیم میں یہ سطور بقید ہوش و حواس اور بہ درستی عقل و فہم ہی تحریر فرمائی ہونگی جن سے انکا مقصد بجز اسکے کچھ اور نہیں ہوگا کہ وہ نہایت حکمت و ہوشیاری کے ساتھ ترجمہ قرآن کی ساری ہی کاوش کو زور بیان، بلاغت زبان، اور تاثیر کلام سے یکسر خالی اور عاری بتا کر ہیچ و پوچ ثابت کر دیں کہ انکی تفہیم القرآن کو مارکیٹ میں جگہ آسانی سے مل جائے اور اب کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں انکے مقصد میں اس پہلو سے خاطر خواہ کامیابی نہیں مل گئی

تفہیم القرآن نے مارکیٹ میں جو مقام حاصل کیا ہے اسکا کسی قدر اندازہ ذیل میں دیئے نقشہ طباعت سے ہو سکتا ہے۔

۱۔ تفہیم القرآن کی پہلی بار اشاعت (علیحدہ کتابی شکل میں ورنہ ترجمان القرآن میں تو بہت پہلے سے اشاعت جاری تھی) ۱۹۵۸ء میں ہوئی تعداد دو ہزار ۲۰۰۰ تھی۔

۲۔ پھر گیارہ سال میں متفرق طور پر ۱۹۶۹ء تک متعدد اشاعتوں میں تیرہ ہزار ایکسو ۱۳۱۰۰ شائع ہوئی۔

۳۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں بارھواں ایڈیشن ایک ہزار ۱۰۰۰ کی تعداد میں نکلا۔

۴۔ چودہ ماہ بعد جنوری ۱۹۷۱ء میں تیرھواں ایڈیشن ایک ہزار ۱۰۰۰ شائع ہوا۔

۵۔ دس ماہ بعد دسمبر ۱۹۷۱ء میں چودھواں ایڈیشن دو ہزار شائع ہوا

راقم سطور کے پیش نظر زیادہ تر یہی چودھواں ایڈیشن رہتا ہے۔ رفتار طباعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسوقت ۱۹۸۰ء تک اسکے دو چار ایڈیشن اور بھی نکل چکے ہونگے۔

علامہ کی آزاد ترجمانی خود انھیں کی زبانی

جیسا کہ سطور بالا میں بار بار گذر چکا ہے کہ علامہ نے دوسرے حضرات مترجمین کے ترجموں کو "لفظی ترجمہ" کے عنوان سے یاد فرمایا ہے اور اپنے انداز ترجمہ کو "ترجمانی" کا لقب دیا ہے اسلئے یہ بات ضروری تھی کہ موصوف اپنے اس دیباچہ تفہیم میں اپنی ترجمانی کی تفسیر و تشریح خود اپنی ہی زبانی فرمادیں کہ ہر پڑھنے والا ترجمہ و ترجمانی کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے انکی "تفہیم" کا مطالعہ کرے۔ چنانچہ موصوف "ترجمانی" کی تشریح یوں فرماتے ہیں :-

"لفظی ترجمہ" میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جنکی تلافی کرنے

کیلئے، ترجمانی، کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھکر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان اپنی زبان میں منتقل کردوں اسلوب میں "ترجمہ پن نہ ہو" ۔ (دیباچہ تفہیم ص۱)

تفہیم القرآن تحریک مودودیت کا خوشنما "درپن" ہے

دیباچہ کے پانچ سات صفحات میں نہایت پُرپیچ اور تکرار آمیز بحث کے بعد اس مقام پر علامہ نے اپنی "آزاد ترجمانی" کی ترجمانی فرمائی ہے ورنہ اس سے پہلے کے صفحات آپ بار بار پڑھ جائیے آپ کو کچھ پتہ نہ چلے گا کہ موصوف "لفظی ترجمہ" یا صرف ترجمہ کسے کہہ رہے ہیں اور "ترجمانی" سے انکی مراد کیا ہے؟

راقم السطور نے تو موصوف کے اس دیباچہ کی "شان نزول" اور "وجہ تصنیف" یہی سمجھی ہے کہ علامہ نے دیباچہ کے ابتدائی صفحات میں پہلے تو دوسرے "قدیم تراجم" کو مختلف پہلوؤں سے مجروح تنقید فرما کر انھیں "ناقص" "بے اثر" اور "غیر مفید" قرار دیا اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد اپنی "آزاد ترجمانی" کی تعریف و توصیف بلکہ "قصیدہ خوانی" فرمائی ہے جسکا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ دیگر قدیم تراجم میں تو "ترجمہ پن" تھا اور گوناگوں "خامیاں" بھی تھیں قرآن مجید کی اصل و صحیح ترجمانی کی مصداق اگر کوئی تفسیر و ترجمانی ہے تو علامہ کی یہی "تفہیم القرآن" ہے جس میں "آزاد ادبی پن" بھی ہے اور "نیاپن" بھی بلکہ بظاہر کوئی مضائقہ نہیں محسوس ہوتا اگر ان دو مقفیٰ

نقروں کے ساتھ ایک تیسرے ہم قافیہ نقرے کا اضافہ کرتے ہوئے کہہ دیا جائے
کہ علامہ کی "تفہیم القرآن" "آزادانہ پن" اور "نیا پن" کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ
علامہ کی اصل تحریک مودودیت کا ایک خوشنما "درپن" بھی ہے۔

دیباچہ تفہیم کا آپریشن ختم ہوتا ہے

ناظرین سے التماس ہے کہ براہ کرم میری مندرجہ بالا تمام ہی معروضات کو بنظر غور وانصاف ملاحظہ فرمائیں امید ہے کہ آپ بھی اس نتیجہ تک ضرور پہونچ جائیں گے کہ دیباچۂ تفہیم کا یہ آپریشن جو ان صفحات گذشتہ میں کیا گیا ہے اور علامہ کی بیان فرمودہ وجوہ تصنیف کا تجزیہ جس طور پر کیا گیا ہے یہ کسی طرح بھی تو موصوف کے اس تجزیۂ آپریشن سے مختلف نہیں ہے جسے انھوں نے اپنے نزدیک قابل قدر تراجم کے حق میں روا رکھا ہے (جسکی چند مثالیں دیباچۂ تفہیم سے اقتباس کر کے پیش بھی کیجا چکی ہیں) جس طرح علامہ کے نزدیک وہ قدیم تراجم اسقدر لائق آپریشن ہوتے ہوئے بھی قابل قدر تھے بالکل اسی طرح علامہ کی یہ ساری کاوشیں احقر کے اس تجزیہ و تبصرہ اور اس آپریشن کے باوجود قابل قدر باقی رہ سکتی ہیں مجھے یقین ہے کہ جو حضرات علامہ کی اس طرز نگارش کو سراسر مثبت سنجیدہ و تعمیری خیال فرماتے ہونگے اور اسکے اندر چھپے تیر ہائے زہرناکی و خطرناکی کو "قند" و "تریاق" تصور فرماتے ہونگے وہ کسی طرح بھی میری ان معروضات کو غیر مثبت یا غیر تعمیری وغیرہ کا عنوان دیکر ناقابل اعتناء اور نالائق توجہ قرار دیکر صرف نظر نہ فرما سکیں گے ؎

وہ دنیا تھی جہاں تم بند کرتے تھے زباں میری
یہ محشر ہے یہاں سننا پڑے گی داستاں میری

مقدمۂ تفہیم سے متعلق

"تفہیم القرآن کے دیباچہ پر اپنی معروضات گذشتہ صفحات میں پیش کیجا چکی ہیں اب" مقدمۂ تفہیم " کا تجزیہ و تبصرہ پیش خدمت کیا جارہا ہے۔

" علامہ مودودی نے جس طرح اپنے تفسیری دیباچہ میں اپنی "تفسیر نویسی" اور "آزاد ترجمانی" کی ضرورت پر روشنی ڈالنا ضروری سمجھا تھا اور اسکی وہی تمہیدی توجیہات انکی خود گرفتاری کیلئے جال بنتی چلی گئیں تھیں ٹھیک اسی طرح انکے تفسیری مقدمے کے بالکل ابتدائی اور تمہیدی فقرے جو بظاہر رفع اشکال کیلئے لکھے گئے تھے کسی اشکال کو رفع تو کیا کرتے الٹے خود وجہ اشکال ہی بن گئے ہیں۔

علامہ کی یہ ہمت قابل داد ہے

ابتک کسی مسلمان کے وہم و گمان اور حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ کوئی انسان کتاب اللہ کا پیش لفظ اور قرآن مجید کا مقدمہ بھی لکھ سکتا ہے مگر آپکو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ علامہ کے نزدیک قرآن مجید کا مقدمہ لکھا جانا بھی ممکن ہے کیونکہ انکار تو کسی ایسی ہی بات کا کیا جاتا ہے جو امکان کا پہلو بھی تو رکھتی ہو باقی ناممکن بات کا انکار تو نہ تو معقول ہی ہے اور نہ رائج و مستعمل ہی ہے، ایسی صورت میں علامہ کا یہ "ارشاد انکاری" بھی انکے خفیہ و درپردہ اقرار ہی کا پتہ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو آغاز مقدمہ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

• ان گزارشوں میں لفظ مقدمہ دیکھکر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدمہ لکھ رہا ہوں یہ قرآن کا نہیں "تفہیم القرآن" کا مقدمہ ہے؟

(مقدمہ تفہیم ص۱۳)

مدارس عربیہ کی چہار دیواریوں میں پرانے دقیانوسی قسم کے علماء و طلباء کے ملقوں میں "دفع دخل مقدر" کی اصطلاح ایک معروف و متعارف چیز ہے لیکن وہاں بھی دخل مقدر کسی بات کا وہی پہلو ہوتا ہے جو فی الحقیقۃ متوقع و ممکن اور قرین عقل و فہم بھی ہو باقی ایسا ناممکن و غیر معقول دفع دخل مقدر جیسا کہ علامہ مودودی نے اسی جگہ "ازراہ تفنن" اختیار فرمایا ہے تو ایسا "دفع دخل" تو شاید ہی کسی نے دیکھا سنا ہوگا۔

ناظرین تفہیم سے علامہ کی خوش فہمی

علامہ کے اس "دفع دخل" اور پیش بندی کو دیکھکر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی موصوف کو اپنے ناظرین کے متعلق اس حد تک "خوش فہمی" یا بدگمانی ہے کہ وہ لوگ صرف مقدمہ کا عنوان ہی دیکھکر خواہ مخواہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں گے کہ یہ مقدمہ کہیں اصل قرآن مجید ہی کا تو مقدمہ نہیں ہے؟ اگر ہمارا یہ احساس صحیح ہے تو بات کا یہ پہلو بھی بڑی حد تک خطرناک ہے اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے ناظرین سے متعلق ایسی خوش فہمی کیلئے علامہ کے پاس کیا وجہ جواز ہو گی؟ شاید علامہ یہ خیال فرماتے ہونگے کہ ان سے پہلے جن حضرات نے تفسیریں لکھی ہیں کسی نے مقدمۂ تفسیر نہ لکھا ہو گا! علامہ ہی کی شخصیت ایسی ہے جس نے پہلی مرتبہ "تفسیری مقدمہ" لکھا ہے اور یوں "دفع دخل" کی ضرورت محسوس ہوئی۔؟

اے روشنئ طبع!

"اے روشنئ طبع تو برمن بلا شدی" یہ مصرعہ مشہور علامہ نے بھی بار ہا پڑھا ہوگا اور انھیں یہ وسوسہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ کسی وقت یہ مصرع ان پر بھی چسپاں ہو جائیگا مگر نیرنگیٔ حالات و مقدرات دیکھئے کہ آج یہی روشنی طبع انکے حق میں بھی بلا بن رہی ہے اور ازراہ تفنن" دفع دخل" کا مختصر سا فقرہ موصوف کے خلاف پورا ایک مقدمہ ہی بن گیا۔

آخر علامہ سے پہلے بھی تو بہت سے مفسرین نے تفسیریں لکھی ہیں اور بعضوں نے مقدمہ بھی لکھا ہے مگر ابتک کسی کو یہ وسوسہ نہیں گذرا کہ وہ اپنی مقدمہ نگاری کیلئے یوں صفائی پیش کرے کہ ـــــ " عنوان میں لفظ مقدمہ دیکھکر کسی کو یہ "غلط فہمی" نہ ہو کہ میں قرآن کا "مقدمہ" لکھ رہا ہوں۔

علامہ کی دلفریب معصومیت

اقتباس بالا میں موصوف نے اپنے ناظرین کو یہ تأثر دینے کی کیسی حسین کوشش فرمائی ہے کہ اگر کسی کو غلط فہمی ہو سکتی ہے تو ان گذارشوں کے عنوان میں صرف لفظ مقدمہ ہی دیکھکر ہو سکتی ہے ورنہ اس عنوان کے تحت جو گوشہ ہائے بحث اٹھائے گئے ہیں وہ موصوف کے نزدیک مطلق غلط فہمی کا سبب نہیں ہیں۔ حالانکہ حقیقت واقعہ یہی ہے کہ اس عنوانِ مقدمہ کے تحت آنیوالے مباحث ہی جس انداز اور جس اسلوب سے پیش کئے گئے ہیں وہی کچھ ایسے نازک اور خطرناک ہو گئے ہیں کہ انھیں پڑھکر اس غلط فہمی کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا ذرا دیر کو یہ سوچنے پر از خود مجبور ہو جاتا

ہے کہ واقعی کہیں یہ مقدمہ اصل قرآن مجید کا تو مقدمہ نہیں ہے۔

تحت الشعور جذبہ کی کارفرمائی

ایسا لگتا ہے کہ علامہ کے تحت الشعور میں ایسا کوئی جذبہ و خیال بھی کارفرما تھا جو انھیں قرآن مجید کا مقدمہ لکھنے کی ضرورت سُجھا اور سمجھا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدمہ تفہیم پڑھتے وقت صاف طور سے یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے کوئی "وسواس" آپ سے بھی یہی کہہ رہا ہو کہ واقعی اس دور میں سخت ضرورت تھی کہ "قرآن مجید" کو عصر حاضر کے ذہن و دماغ کا لحاظ کرتے ہوئے بالکل ہی نئے سرے سے "ایڈٹ" کیا جائے اور اس پر ایک "مبسوط مقدمہ" لکھکر "نظم قرآنی" اور "کلام الٰہی" کا وہ "خلا" پُر اور وہ "جھول" دور کیا جائے جو "فہم و تدبر قرآن" کی راہ میں حائل ہے۔

ہو سکتا ہے اسی "وسواس" نے علامہ کو بھی اسی خیال کے تحت "مقدمہ نگاری" کی ضرورت سجھائی اور سمجھائی ہو بلکہ عین ممکن ہے کہ علامہ کی "طبع وقاد" اور "ذہن نقاد" میں یہ حوصلہ اور جذبہ بھی کہیں انگڑائیاں دلینے لگا ہو کہ اگر یہ مقدمہ بھی "فہم قرآنی کیلئے کافی ثابت نہ ہوا تو پھر بدرجۂ مجبوری اسکا کوئی "استدراک" یا "تکملہ" بھی لکھنا ہوگا جسکے لئے وہ اپنی صلاحیت کا اعتراف بڑے لطیف انداز میں پہلے ہی دیباچۂ تفہیم میں یوں فرما چکے ہیں کہ "اس تشنگی کو بجھانے کیلئے کچھ نہ کچھ خدمت میں کر سکتا ہوں"۔

ناظرین فیصلہ فرمائیں

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "مقدمہ تفہیم" سے کچھ اقتباسات پیش کرکے

وہ گوشہ ہائے بحث بھی ذرا اجاگر اور نمایاں کر دیئے جائیں جنکی بنا پر علامہ کو ازالہ غلط فہمی کی ضرورت (اپنے تحت الشعور کے کسی جذبہ کی تحریک پر) محسوس ہوئی اور یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ "یہ مقدمہ" مقدمۂ قرآن مجید ہے یا مقدمۂ تفہیم القرآن؟

علامہ موصوف صرف ابتدائے مقدمہ ہی میں چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں :-

"(الف) عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں انمیں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک "اجنبی" رہا ہے پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ کتاب ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل موضوع کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ سے بحث کیجائیگی اور اسطرح زندگی کے ایک ایک شعبہ کو بھی الگ کر کے اسکے متعلق احکام اور ہدایات سلسلہ وار درج ہونگی۔ لیکن جب وہ کتاب کھولکر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی انداز سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اجتک بالکل ناآشنا تھا"۔ (مقدمۂ تفہیم ص۱۳ ج اول)

علامہ کا یہ مقدمہ ص۱۳ سے شروع ہو کر ص۴۴ تک تقریباً ۳۲ صفحات تک پھیلا ہوا ہے

اور اسکا ایک معتد بہ حصہ تقریباً اسی قسم کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے مختلف اور متعدد دلائل کے ذریعہ پہلے تو قرآن مجید کو "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" سے خالی و عاری ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور اس طرح اپنے "مزعومہ و منصوبہ" کی ضرورت خود پیدا کر کے ایک مصلح و محقق کے انداز میں مقدمہ نگاری کے فرائض انجام دیئے ہیں گویا علامہ کا یہ مقدمہ ع۔ تمھیں نے درد دیا ہے تمھیں دوا دینا۔ کا صحیح مصداق ہے۔ یعنی پہلے تو موصوف نے ناظرین کے ذہنوں کو قرآن مجید کے اسلوب بیان وغیرہ کی طرف سے غیر مطمئن اور متزلزل کرنے کی پیہم اور مسلسل جدوجہد فرمائی اور مکرر سہ کرر انداز میں اپنے "خصوصی مقدمہ" کیلئے ضرورت پیدا کی اور بار بار کی کوششوں کے بعد جب لوگوں کے دل و دماغ انکے "مضامین عالیہ" سننے کیلئے پوری طرح آمادہ و تیار ہو گئے تو موصوف نے "قرآن فہمی" کی راہ کشادہ فرمانے کیلئے یہ مقدمہ تحریر فرما دیا جو اپنی نظیر آپ ہے اور جسکا ایک اقتباس اوپر مذکور ہو چکا ہے اور مزید کچھ دوسرے اقتباسات آئندہ آئیں گے اور آپ انھیں ملاحظہ فرما کر اپنے آپکو تائید پر مجبور پائیں گے۔

علامہ کی ایک اور خوش فہمی

علامہ نے اپنے مقدمہ کے مندرجہ بالا اقتباس میں قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کے سلسلہ میں جس انداز پر تبصرہ فرمایا ہے اسکو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو خود اپنے متعلق "خوش فہمی" "ہمہ دانی" کا احساس ہے شاید اتنا ہی احساس اپنے ناظرین کی "ہیچمدانی" کا بھی ہے اور موصوف کو ناظرین تفہیم کے

متعلق بالکل بیجا طور پر یہ بدگمانی ہے کہ ان میں سے کسی نے نہ تو مقدمہ تفہیم کے علاوہ کسی دوسری تفسیر کا مقدمہ دیکھا اور پڑھا ہوگا اور نہ ہی دوسری کتابوں کا قطعاً مطالعہ ہی کیا ہوگا بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیا جائے کہ شاید ناظرین تفہیم نے جماعت اسلامی اور تحریک مودودیت سے متعلق لٹریچر کے سوا کوئی دوسری کتاب ہی نہیں دیکھی ہوگی جو جماعتی لٹریچر کے اسلوب بیان اور معیار تصنیف سے ذرا کچھ ہٹی ہوئی اور مختلف ہو۔

کیا علامہ بتا سکتے ہیں؟

اقتباس مندرجہ بالا میں انھوں نے کتاب کا جو تصور اور خاکہ پیش فرمایا ہے (پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل موضوع کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلہ پر بحث کیجائے گی) تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ سارے قیود و شروط مرتبات کیلئے ضروری ہیں کہ بغیر ان کے کتاب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا؟ اگر جواب نفی میں ہو اور یقیناً نفی ہی میں ہو سکتا ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ آخر یہ حق آپ کو کس نے دیا کہ آپ اپنی طرف سے کتاب کا ایک خاص مفہوم اور خاص تصور متعین کر لیں اور پھر اپنے مزعومہ ومنصوبہ تصور کے خلاف پاکر قرآن کی "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کو اپنا تنقید و تبصرہ کا نشانہ بھی بنائیں اور اسکو تصنیفی ترتیب و کتابی اسلوب سے خالی و عاری بھی قرار دے لیں۔

تعجب ہے علامہ کی خوش فہمی پر

موصوف نے اپنے جذبۂ ہمنائی کے تقاضے سے مجبور ہو کر "مقدمہ قرآن"

لکھنے پر تو کتنا زور قلم صرف فرمایا مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ اگر کسی نے دوسری کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور انکی "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کا بھی جائزہ لیا ہوگا تو پھر بات کسطرح بنے گی؟

کیا تصنیفی ترتیب یا کتابی اسلوب کا عیب قرآن مجید میں موجود بھی ہے؟

علامہ کی خوش فہمی پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگر کسی نے دوسری کتابوں کا بھی جائزہ لیا ہوگا تو پھر بات کس طرح بنے گی، تو لیجئے ہم آئندہ سطور میں دوسری آسمانی کتابوں کی بعض مندرجات تقابلی مطالعہ کیلئے پیش بھی کئے دیتے ہیں تاکہ علامہ کی ان دوراز کار موشگافیوں کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ واقعہ یہی ہے کہ "قرآن فہمی" اور اس سے ہدایت یابی اور اصلاح پذیری کے سلسلہ میں قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور اسکا "کتابی اسلوب" ہرگز رکاوٹ اور مانع نہیں ہے بلکہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے اور قرآن مجید اور دوسری کتب مذہب سے تقابل کیا جائے تو واضح ہوجائیگا کہ قرآن مجید کے اسلوب اور دوسری کتب مذہب کے اسالیب میں کوئی مقابلہ کرنا بھی صحیح بات نہ ہوگی کیونکہ قرآن مجید اپنے اصل اسلوب میں محفوظ ہے جو دوسری کتابوں سے کہیں زیادہ معیاری ہے۔ باقی علامہ کا یہ زعم کہ جب تک انکا یہ خصوصی مقدمہ لوگوں کے مطالعہ میں نہ آئیگا اُن پر قرآن فہمی اور ہدایت یابی کی راہیں کشادہ نہ ہونگی تو یہ موصوف کی محض خام خیالی ہے۔ ذیل میں تفسیر حقانی سے اقتباس کرتے ہوئے ایک نقشہ پیش کیا جارہا ہے :۔

قرآن مجید اور دیگر کتب مذاہب کا تقابلی نقشہ

قرآن مجید :۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ۙ تمام خوبیاں اللہ کو جو تمام عالم کا پرورش کرنیوالا ہے۔
الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ۙ بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔
مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ؕ جزا کے دن کا مالک ہے۔
اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ؕ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔
اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ۙ ہمیں سیدھی راہ چلا۔
صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۝ۙ راہ ان لوگوں کی جنپر تونے انعام کیا
غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ۝ؑ نہ انکی جنپر غضب نازل ہوا، نہ گمراہوں کی

زبور :۔

مبارک وہ آدمی ہے کہ جو شریروں کی صلاح پر نہیں چلتا اور خطا کاروں کی راہ پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کے جلسہ میں نہیں بیٹھتا بلکہ خداوند کی شریعت میں مگن رہتا ہے اور دن رات اسکی شریعت میں سوچا کرتا ہے سو وہ اس درخت کی مانند ہوگا جو پانی کی نہروں کے کنارے پر لگایا جائے اور اپنے وقت پر میوہ دے، جسکے پتے مرجھاتے نہیں۔ اور وہ اپنے ہر ایک کام میں پھولتا پھلتا رہے گا۔ شریر ایسے نہیں بلکہ وہ بھوسی کی مانند ہیں جسے ہوا اڑا لیجاتی ہے۔ سو شریر عدالت میں

بکھر سے نہیں ہونگے۔ نہ خطاکار سچوں کی جماعت میں۔ کیونکہ خداوند صادقوں کی راہ جانتا ہے۔ پر شریروں کی راہ نیست ونابود ہوگی

توریت :۔

ابتدا میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی اور خدا نے کہا اجالا ہو اور اجالا ہو گیا اور خدا نے اجالے کو دیکھا کہ اچھا ہے اور خدا نے اجالے کو اندھیرے سے جدا کیا اور خدا نے اجالے کو دن کہا اور اندھیرے کو رات سو شام و صبح پہلا دن ہوا اور خدا نے کہا پانیوں کے بیچ فضا ہوئے اور پانیوں کو پانی سے جدا کرے۔ تب خدا نے فضا کو بنایا اور فضا کے نیچے پانیوں کو اوپر کے پانی سے جدا کیا اور خدا نے فضا کو آسمان کہا سو شام اور دوسرا دن ہوا۔

انجیل :۔

یسوع مسیح بن داؤد بن ابرہام کا نسب نامہ ——— ابراہیم سے اضحاق پیدا ہوا اضحاق سے یعقوب پیدا ہوا یعقوب سے یہودا اور اس کے بھائی پیدا ہوئے اور یہودا سے پہارس اور زارح تمر کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور پہارس سے حصروم پیدا ہوا اور حصروم سے آرام پیدا ہوا اور آرام سے عمیذاب پیدا ہوا اور عمیذاب سے نحسون پیدا ہوا نحسون سے سلمون پیدا ہوا اور سلمون سے بوعز راحت کے پیٹ سے پیدا ہوا وغیرہ وغیرہ۔

سابق کتابی تصور کا ہوّا!

کتب اربعہ سماویہ (چار آسمانی کتابوں) کے اقتباسات صرف اسلئے نقل کئے گئے ہیں کہ عام ناظرین انھیں ملاحظہ فرماکر "سابق کتابی تصور کا ہوّا" بھی بچشم خود دیکھ لیں اور فیصلہ فرمائیں کہ علامہ مودودی نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں سابق کتابی تصور کا جو ہوا کھڑا کر دیا ہے (جسکی وجہ سے قرآن مجید کو صحیح معنوں میں "کتاب" سمجھنا اور کہنا بھی انکے لئے ایک اچھا خاصا مسئلہ بن گیا ہے) یہ ہوّا اصلی اور واقعی نہیں ہے بلکہ موصوف کا قائم کیا ہوا انکا "ذہنی و خیالی ہوّا" ہے۔

تفہیم القرآن فروغِ مودودیت کیلئے ایک کامیاب حربہ

دین کے اس دورِ انحطاط و اضمحلال میں بھی مسلمان کو "قرآن" اور "صاحب قرآن" سے جو کچھ شغف ہے علامہ مودودی جیسا صاحبِ ادراک اس سے ناواقف اور بیخبر کیسے ہو سکتا ہے اسلئے موصوف یہ رائے قائم کرنے میں بالکل حق بجانب ہوئے کہ "فروغ مودودیت" کیلئے بہترین ذریعہ اور کامیاب ترین حربہ تفسیر قرآن ہی کا ہو سکتا ہے اور وہ تفسیر بھی ایسی ہو جو صرف اسی مقصد کیلئے تصنیف فرمائی گئی ہو، کیونکہ تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو تو علامہ پہلے ہی نالائق تعلیم قرار دے چکے ہیں چنانچہ اپنے ایک پرانے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں

(الف) "قرآن و سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں" (تنقیحات صـ ۱۲۶)

(ب) "قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے" (تنقیحات ص۲۱۲)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے

جب کتب تفسیر کا پرانا ذخیرہ نالائق اعتماد ناقابل تعلیم ٹھہرا اور جب قرآن فہمی کیلئے کسی تفسیر کی بھی حاجت نہیں ہے تو پھر علامہ نے یہ زحمت تصنیف گوارا ہی کیوں کی؟ اور یہ تفہیم القرآن لکھی ہی کیوں؟ اور لکھی بھی تھی تو پھر پرانے ذخیرۂ تفسیر سے بے نیاز ہو کر محض اپنی عقل وطبیعت سے کیسے لکھدی؟ حالانکہ احادیث شریف میں اسکی مذمت اور اس پر وعیدیں وارد ہیں اور علامہ جیسا وسیع المطالعہ ان سے یقیناً بے خبر نہ ہوگا۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ:۔

"جس شخص نے قرآن شریف کی تفسیر میں اپنی طرف سے کچھ کہا (تفسیر بالرائے کی) اسکو چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے" (والعیاذ باللہ منہ)۔

ہم نہیں سمجھ سکے

جب قرآن فہمی کیلئے کسی تفسیر کی ضرورت وحاجت ہی نہیں بلکہ ہر اعلیٰ درجہ کا پروفیسر درس قرآن دے سکتا ہے تو پھر یہ بے ضرورت کام علامہ نے کیوں کیا؟

ہم نے مانا کہ عربی مدارس کے فاضلین اپنی ناقص استعداد اور بے صلاحیتی کے باعث علامہ کی بلند نظر میں نہ آسکے ہونگے لیکن کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان

کے لئے تو ایسی بدگمانی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ انمیں بھی اب درس قرآن کی صلاحیت رکھنے والے افراد نہ پاسئے جاتے ہوں۔

ایسی صورت میں علامہ کی یہ خامہ فرسائی بالکل غیرضروری قرار پاتی ہے یا پھر تفہیم القرآن کی اس تصنیفی کاوش میں" فروغ مودودیت" کا جذبہ کارفرما ہے اور ہونہ ہو یہ سب فروغ مودودیت ہی کیلئے کیا گیا ہو۔ اور اسی منصوبہ کے تحت علامہ مودودی نے یہ بھی ضروری خیال فرمایا کہ وہ اصل تفسیر سے پہلے اپنی تفہیم القرآن کا" دیباچہ" لکھیں جسمیں اپنے سے پیشتر مترجمین ومفسرین کے تراجم وتفاسیر کی خامیاں اور انکے نقائص وانکشاف بھی کردیں اسکے بعد قرآن مجید کا یا تفہیم القرآن کا" مقدمہ" بھی تحریر فرمادیں جسکے ذریعہ قرآن مجید کے اسلوب کو کتابی وتصنیفی اعتبار سے بھی مکمل فرماسکیں۔

علامہ نے اپنے اس" تفسیری مقدمہ" میں صرف انھیں گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور انھیں پہلوؤں سے بحث فرمائی ہے جس کا ذکر کسی کتاب کے آغاز میں عام طور پر مقدمۃ الکتاب کے زیر عنوان کیا جاتا ہے۔ لیکن موصوف نے اپنی مقدمہ نگاری کے لئے خطوط ایسے تجویز کئے اور انداز ایسا" پرحکمت اور" فنکارانہ" اختیار فرمایا کہ ہر ناظر مقدمہ" قرآن فہمی کے مقصد میں خواہ کامیاب ہو یا نہ ہو لیکن" تحریک مودودیت" کی پوری حقیقت اور اسکی تدریجی رفتار وترقی کا اندازہ اس سے مکمل طور پر ضرور ہوجائے گا چنانچہ آپ علامہ کے اس مقدمہ تفہیم کو اگر بنظر غائر ملاحظہ فرمائیں گے تو بڑی آسانی سے یہ حقیقت آپکی سمجھ میں بھی آجائیگی کہ تحریک مودودیت کا اصل نقطہ آغاز یعنی" قیام حکومت الہیہ" کس لطیف پیرایہ میں پورے تفسیری دیباچہ ومقدمہ بلکہ اصل تفہیم القرآن ہی کا مرکزی مضمون بنا ہوا ہے۔ موصوف کو جہاں بھی ذرا موقع ملتا ہے تو وہ اپنی

اس "حقیقت منتظرہ" کی جلوہ نمائی کیلئے بڑی طرح مضطرب اور بے چین نظر آنے لگے ہیں مگر وہ "حقیقت منتظرہ" ایسی ہے کہ دورِ نبوت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد دنیا سے ایسی رخصت ہوئی کہ کسی طرح واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اب سنا جا رہا ہے کہ مجبوراً علامہ اس حقیقت منتظرہ کو "لباس مجاز" ہی میں دیکھنے پر آمادہ و تیار ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب "طاغوتی نظام" کے الیکشنوں میں حصہ لیکر اس "حقیقت منتظرہ" کو "لباس مجاز" ہی میں دیکھ لینے پر قناعت کریں۔

قرآن فہمی اور اس سے ہدایت پذیری کی شاہ کلید کیا ہے؟

علامہ مودودی نے اپنی تفہیم میں قرآن فہمی کو آسان بنانے اور تدبر قرآن کی راہیں کشادہ کرنے کیلئے جو جو موشگافیاں فرمائی ہیں اسکی کچھ اہمیت اسی وقت ہو سکتی تھی جب وہ اس سلسلہ میں تھوڑی سی روشنی ان باتوں پر بھی ڈال دیتے کہ فہم قرآنی اور ہدایت ربانی کی "شاہ کلید" کس کے قبضہ میں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے قبضہ اختیار میں رکھا ہے یا علامہ جیسے "مقدمہ نگاروں" کی صلاحیت افہام و تفہیم اور استعداد ابلاغ و تبلیغ پر موقوف فرما دیا ہے؟ کہ جو شخص جتنا زور دار مقدمہ تفسیر یا مقدمہ قرآن لکھ سکے گا اتنا ہی فہم و تدبر قرآن آسان ہو جائیگا۔

خدا جانے کیوں علامہ نے اتنی بسیار نویسی کے باوجود اس سوال وجواب سے کوئی تعرض اپنے مقدمہ تفہیم میں نہیں فرمایا لیکن بار بار جو گوشہ ہائے بحث علامہ نے چھیڑے ہیں ان سے یہ اندازہ لگا لینا کوئی مشکل نہیں کہ علامہ شاید فہم قرآنی اور تدبر قرآنی

Scanned with CamScanner

کی "شاہ کلید" اپنی صلاحیت تفہیم اور اپنی استعداد و ابلاغ ہی کو سمجھ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ موصوف نے "مقدمہ تفہیم" میں اپنا سارا زور قلم صرف اتنی سی بات پر صرف فرمادیا ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب، اسکا اسلوب، اسکا انداز بیان وغیرہ سب ہی کچھ بالکل "اجنبی" و "غیر مانوس" ہے جسکی وجہ سے ابتک اسکے فہم و تدبر کی راہیں بند پڑی تھیں۔ علامہ کی تفہیم القرآن تصنیف ہونے سے پہلے جو شخص بھی قرآن مجید سمجھنے کی کوشش کرتا تھا اسے اپنے سابق "کتابی تصور" کے خلاف پاکر پریشان ہوجاتا تھا۔ جیساکہ ہم آئندہ مقدمہ تفہیم سے نقل کریں گے۔

علامہ کی ہمہ دانی خود علامہ کی زبانی

قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور اسکے "کتابی اسلوب" کو مجروح فرماتے ہوئے جس لطیف انداز سے علامہ نے اپنی "ہمہ دانی" پر "قصیدہ خوانی" فرمائی ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ موصوف ہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو اسی اقتباس بالا کے چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں

"جب وہ کتاب کھولکر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا ——— بابوں اور فصلوں کا کہیں نشان تک نہیں، تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات ہیں تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں، انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو علوم طبعی کے طریقہ

پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو
علوم عمران کے طرز پر نہیں، قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان
ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، اخلاق کی تعلیم ہے
تو فلسفہ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اسکا انداز جدا۔ یہ سب اپنے
سابق "کتابی تصور" کے خلاف پاکر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور
اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک "غیر مرتب" غیر مربوط " منتشر"
کلام ہے جو اول سے لیکر آخر تک "بے شمار" چھوٹے بڑے مختلف
"شذرات" پر مشتمل ہے مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھدیا گیا ہے"
(مقدمہ تفہیم صد ۱۴)

"مقدمہ تفہیم" کے اس طول طویل اقتباس میں علامہ نے اپنی " ہمہ دانی"
"تبحر علمی" کثرت مطالعہ" اور "وسعت نظر" کا ادعا کس پُر حکمت و لطیف انداز میں
فرمادیا ہے اور کس مزے سے مختلف علوم و فنون (تاریخ، فلسفہ و مابعد الطبیعیات
منطق و فلسفہ، علوم طبیعی، تمدن و سیاست، معیشت و معاشرت، علوم عمران، قانون و
اصولِ قانون، اخلاق و فلسفہ اخلاق وغیرہ) کو نام بنام شمار کراتے ہوئے جہاں یہ ارشاد
فرمایا ہے کہ یہ علوم و فنون متعارف طور پر قرآن مجید میں مذکور و موجود نہیں ہیں جسکی وجہ سے
ناظر حیران ہوتا ہے وہیں ان ہی جملوں کے " بین السطور" سے موصوف کا یہ " ادعائے
ہمہ دانی" بھی پھوٹا پڑتا ہے کہ علامہ موصوف ان "جملہ علوم مذکورہ" کے زبردست " اسکالر
یا ماسٹر اور پروفیسر" ہیں۔ ان علوم کی اکثر و بیشتر کتابیں انکی نظر میں ہیں تو کیسی سہل انگاری
کے ساتھ وہ دوسرے علوم کی مختلف علمی کتابوں سے قرآن مجید کا موازنہ و تقابل فرماتے

ہوئے قرآن مجید کو "کتابی اسلوب" اور "تصنیفی ترتیب" کے خلاف بھی قرار دے رہے ہیں۔

علامہ کے اس "بین السطور" ادعا کو پڑھکر بیساختہ داد دینی پڑتی ہے کہ موصوف نے کیسے فنکارانہ اور "پُرکارانہ" انداز میں اپنے ناظرین کو اپنی "شان علم" سے متأثر و مرعوب فرمانے کی کیسی حسین کوشش فرمائی ہے۔

علامہ کی ہمہ دانی دوسروں کی زبانی

۵۔ سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا

"قصیدہ خوانی" اوپر پیش کیجاچکی ہے اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ ہو کہ موصوف کا علم دوسرے اہل علم کی نظر میں کتنا ہے؟ علامہ کی علمی سطح کا جائزہ لینے کے لئے خود موصوف کے دو قدیم رفیق کار اصحاب علم کے تبصرے ملاحظہ ہوں، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی جماعت اسلامی سے اپنی علٰحدگی کی روداد بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا مودودی (حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی "علامہ" کو مولانا لکھنا گوارا فرما لیتے ہونگے) تفہیم القرآن لکھنا شروع کیا تھا اسوقت تک سورۂ بقرہ کے ابتدائی چند رکوع ہی وہ لکھ چکے تھے انھوں نے یہ حصہ ایک مخصوص صحبت میں مجھے (مولانا نعمانی) اور مولانا امین احسن کو سنایا مولانا امین احسن نے انھیں

مشورہ دیا کہ ـــــ اب آپ اپنے آپ کو علمی کاموں میں زیادہ مصروف نہ کریں۔

عقلمند کو اشارہ ہی کافی ہوتا ہے

لیکن تفہیم القرآن کے تکمیل پا جانے سے شبہ ہوتا ہے کہ یا تو علامہ نے مولانا اصلاحی کے اشارہ کو سرے سے سمجھا ہی نہیں یا اسے اپنے منصوبہ کے خلاف سمجھتے ہوئے قابل سماعت ہی نہ سمجھا ہو اور اپنی "حقیقت منتظرہ" سے متعلق اسے نصیحت نادان قرار دے لیا ہو۔ کیونکہ یہ حقیقت یقیناً ناقابل انکار ہے کہ موصوف کے مزعومات اور منصوبہ جات کی تکمیل کے لئے تفہیم القرآن کی تکمیل بھی از بس ضروری تھی کہ وہ اس صورت میں اپنے "ہر منصوبہ" کو کسی آیت کی تفسیر کے ذیل میں پیش کر کے اپنے ناظرین کو اسکی دعوت بھی دے سکتے تھے۔ کہنے کے لئے اپنے بچاؤ میں یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ تحریک مودودیت کی طرف دعوت نہیں ہے یہ تو دعوت الی الکتاب ہے اور اسطرح لوگوں پر فہم و تدبر قرآن کی راہیں کشادہ کیجا رہی ہیں۔

اشارہ کافی نہ ہو تو صراحت بھی ملاحظہ فرمالیں

مولانا امین احسن صاحب نے علامہ کو اشارۃً جو مشورہ دیا تھا اسکا مطلب واقعۃً وہی تھا جسکی طرف ابھی ابھی اشارہ کیا گیا یعنی مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک علامہ تفسیر نگاری کے لئے اہل و موزوں نہ تھے جیسا کہ مولانا نعمانی صاحب اسی سلسلۂ کلام میں مزید صراحت کے ساتھ ارشاد فرماتے ہیں: ۔

Scanned with CamScanner

"دوسرے وقت مولوی امین احسن صاحب نے مجھ سے (مولانا نعمانی صاحب سے) یہ بھی کہا کہ میں نے یہ مشورہ مولانا مودودی کو اسلئے بھی دیا تھا کہ جو کچھ اسوقت انھوں نے سنایا اس سے میں نے اندازہ کیا مولانا کے علم کے بارے میں جو اندازہ انکے مضامین سے تھا انکا علم اس سے بہت کم ہے۔ خاصکر قرآن مجید کے بارے میں انکا علم و فکر بہت سطحی ہے اور قرآن پر غور کرنے کے لیے "علوم عربیت" خاص کر نحو سے جتنی واقفیت ضروری ہے مولانا نے اسکو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

سلسلہ کلام میں مولانا اصلاحی کا یہ ظریفانہ فقرہ اب تک حافظہ میں بالکل انھیں کے لفظوں میں محفوظ ہے کہ —— "بھئی میں تو مولانا کی "علمی سطح" کے بارے میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ لا فرق بینہ و بین پرویز" (علامہ مودودی اور پروفیسر پرویز میں "علمی سطح" کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے)۔

(جماعت اسلامی سے مجلس مشاورت تک ۳۲)

یہ ایک نہیں دو شہادتیں ہوئیں

علامہ کی علوم "عربیت سے" بیگانگی و ناواقفیت پر مندرجہ بالا شہادت درحقیقت دو شہادتوں کا مجموعہ ہے کیونکہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب جیسے صاحب علم اور دانائے علوم عربیت علامہ مودودی کے خلاف شہادت دے رہے

Scanned with CamScanner

اور مولانا نعمانی جیسے دوسرے صاحب علم اپنی تائید و تصدیق کے ساتھ انکی شہادت نقل فرما رہے ہیں

ایک اور علمی شہادت

محدث اعظم ہند حضرت علامہ شاہ محمد انور صاحب علیہ الرحمہ کشمیری کے مشہور شاگرد رشید ہند و پاک کے مشہور عالم و محدث مولانا محمد یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ اپنے رسالہ "بینات بابت رجب ۹۶ھ مطابق اگست ۷۶ء میں" بصائر و عبر" کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں :-

"مودودی صاحب کی شخصیت ابھرنے کا اصل راز"

" یہ دونوں بزرگ (مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی) عرصہ تک مودودی صاحب کے دست دباز دبنے رہے مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم نے عربی ادب سے کے ذریعہ خدمات انجام دیں اور مودودی صاحب کی تحریرات اور کتابوں کے آب و تاب سے عربی تراجم کئے اور تربیت کر کے چند شاگردوں کو بھی تیار کر دیا . . . . . . عرب ممالک میں خصوصاً سعودی عرب کو متأثر کرنے کے لئے اور وہاں کے شیوخ کو ہمنوا بنانے کے لئے مختلف انداز سے کام کیا اور اسے اس انداز سے پیش کیا جاتا رہا کہ یہ سب کچھ مودودی صاحب کی توجہات کی رہین منت ہیں اس سے انکی

"شخصیت" بننی شروع ہوگئی اور تمام جماعت کے افراد کی تالیفات سے خود وجاہت کا فائدہ اٹھایا (اصطلاح فقہ میں "شرکت وجوہ" اسی انداز کی ایک شرکت کا نام ہے جس میں ایک شخص محنت کرتا ہے اور دوسرا اپنی وجاہت وشہرت کے اثر سے کاروبار میں شریک ہوکر فائدہ اٹھاتا ہے)

خود عربی لکھنے سے معذور، انگریزی لکھنے سے معذور نہ عربی لکھ سکتا ہے نہ بول سکتا ہے (یہ صیغہ واحد مولانا بنوری کی پشاوری زبان کا اثر ہے مولانا کا مقصد یہی ہے کہ علامہ مودودی صاحب نہ عربی لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں) یہی انگریزی کا حال بھی ہے لیکن جو کتابیں ترجمہ کی گئیں انکے سرورق پر یہی لکھا گیا "تالیفات المودودی" کہیں یہ نہ لکھا کہ یہ ترجمہ مسعود عالم کا ہے یا "عاصم حداد" کا ہے لوگ سمجھے کہ اردو کا یہ ادیب گویا عربی کا بھی امام ہے حالانکہ بے چارے مقتدی بھی نہ تھے"

(ماہنامہ "بینات" کراچی بحوالہ اکارامت ص۳۵)

لائق توجہ مزید انکشاف

یہی مولانا یوسف صاحب بنوری علیہ الرحمہ اپنے عربی رسالہ "الاستاذ المودودی" میں یہ انکشاف فرما رہے ہیں کہ علامہ مودودی صاحب نے دمشق کے کسی اجتماع میں اپنا مقالہ عربی کی بجائے اردو میں پیش فرمایا اور سامعین کو حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب

ندوی سے اسکی ترجمانی کرانی پڑی" (الاستاذ المودودی ص ۱۱ حصہ اول)

ایک اور شہادتِ حق

دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل نے جو جماعت اسلامی سے باضابطہ وابستہ بھی تھے اب سے تقریباً ۲۳ سال پہلے اپنے استاذ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے زمانۂ حیات میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال فرمایا تھا جس میں یہ کوشش فرمائی تھی کہ حضرات دارالعلوم جماعت (اسلامی) والوں سے اختلاف رکھنے میں شدت نہ اختیار فرمائیں کیونکہ ان صاحب کے خیال میں اختلافات اصولی قسم کے نہ تھے بلکہ صرف فروعی اختلافات تھے۔ دارالعلوم کی جانب سے انھیں جو کچھ جواب دیا گیا وہ "مودودی دستور و عقائد کی حقیقت" کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں دیوبند سے اسی زمانہ میں شائع بھی کر دیا گیا تھا۔ اسی رسالہ کے ص ۲۹ پر ان فاضل دارالعلوم کے مکتوب سے یہ جملے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

> "صرف تحریک اقامت دین کی صحت کی بناء پر جماعت اسلامی کا رکن ہوں اور تحقیقی طور پر معلوم کر چکا ہوں کہ جماعت اسلامی اور علمائے دیوبند کے درمیان بعض مسائل میں فروعی اختلاف ہے اصولی قطعاً نہیں ہے اور مودودی صاحب نے بوجہ علم کامل نہ ہونے کے اپنی تحریرات میں جو واقعی غلطیاں کیں ہیں انمیں حق بجانب علمائے دیوبند ہیں"
>
> (مودودی دستور و عقائد کی حقیقت)

یہ بزرگوار فاضل دیوبند جماعت اسلامی کے رکن بھی تھے (جنکی صراحت انکے اسی خط میں موجود بھی ہے) کتنے واضح الفاظ میں علامہ کا علم میں کامل نہ ہونا اور علامہ کا یہ غلط ہونا' علمائے دیوبند کا حق بجانب ہونا سب کچھ فرما رہے ہیں۔

یہ شہادت حق اسلئے زیادہ لائق توجہ ہے کہ موصوف اگر ایک طرف فاضل دارالعلوم ہیں تو دوسری طرف جماعت کے رکن بھی ہیں۔

خلاصۂ معروضات یہ ہوا کہ "شہادت اربعہ" مذکورہ بالا کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ علامہ نے مندرجہ بالا اقتباس مقدمہ میں اپنی "ہمہ دانی" کے "بین السطوری" ادعاء سے ناظرین کو مرعوب کرنے کی جو "پرکار" کوشش فرمائی ہے موصوف اپنی اس کوشش میں پوری طرح ناکام ہوگئے۔

آخر کار سمجھنے والوں نے حقیقت کو سمجھ ہی لیا اور پاتے والے "سراغ حقیقت" پا ہی گئے کہ علامہ کے علم کے بارے میں جو اندازہ ابتک انکے مضامین پڑھکر لگایا جاتا رہا ہے انکا علم اس سے بہت کم ہے۔ خاصکر قرآن مجید کے بارے میں تو انکا علم ونظر بہت سطحی ہے۔

مقدمۂ تفہیم کے دو اقتباسات پر تبصرہ پیش نظر کیا جا چکا ہے جن میں علامہ نے قرآن مجید کو "عام کتابی تصور" اور "تصنیفی ترتیب" سے مختلف' غیر مانوس و اجنبی طرز کی کتاب ثابت فرماکر اپنی "مقدمہ نگاری" کیلئے اپنے ناظرین کی "ذہن سازی" فرمائی ہے لیکن ظاہر ہے کہ قرآن مجید کا مقدمۃ الکتاب لکھنے کیلئے محض اتنی بات تو وجہ جواز نہیں ہو سکتی تھی اسلئے موصوف نے اپنے دیباچہ میں جس طرح جملہ تراجم و تفاسیر پر خط نسخ و بطلان کھینچنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا تھا اور اپنی ترجمانی

کے ماسوا جملہ تراجم قرآنی کو بالکل ہی بے فائدہ "بے معنی" بلکہ قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ ثابت کرنے کیلئے متعدد دلیلیں پیش فرمانی ضروری سمجھی تھیں اسی طرح موصوف اپنے مقدمہ میں بھی سارا زور قلم اس پر صرف فرمارہے ہیں کہ معاذ اللہ خود قرآن مجید بھی اپنے "مخصوص انداز بیان" اور اپنے منفرد "اسلوب تعبیر" اور اپنی خاص اصطلاحی زبان کی وجہ سے "ہدایت پذیری" کی کما حقہ صلاحیت ہی نہیں رکھتا جسکی وجہ سے علامہ موصوف کو فہم و تدبر قرآنی کی راہیں کشادہ کرنے کیلئے یہ دیباچہ و مقدمہ لکھنا پڑا موصوف اپنے اسی مقدمہ کے بالکل آغاز ہی میں یوں رقم طراز ہیں :-

> "ایک عام ناظران باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جنکو ابتدا میں سمجھ لینے سے "فہم قرآن" کی راہ آسان ہو جاتی ہے اور بسا اوقات محض انکے نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں معانی قرآن ہی کی سطح پر گھومتا رہتا ہے۔ گہرائی میں اترنے کا راستہ اسے نہیں ملتا" (مقدمہ تفہیم ص ۱۳)

علامہ کی دو دھاری تلوار

اقتباس بالا میں علامہ کی یہ تحریر کیا ہے دو دھاری تلوار ہے جس نے علامہ سے پیشرو مترجمین و مفسرین کو معانی قرآن کی سطح پر پا کر فنا کے گھاٹ ہی اتار دیا اور ساتھ ہی ساتھ خود آں علامہ کی رسائی بحر المعانی کے قعر تک ثابت کر دی۔

علامہ کی یہ سطور پڑھکر انکا ناظر کیا یہ تاثر نہ لے گا کہ واقعی قرآن فہمی کی اس تہہ تک علامہ کے سوا کوئی دوسرا بھلا کیسے پہونچ سکتا ہے؟ یقیناً یہی تاثر لے گا بلکہ واقعہ تو یہ ہے علامہ کے ناظرین نے بالعموم یہی تاثر لیا بھی ہے جیسا کہ عام طور پر مشاہدہ ہے۔

ایسی صورت میں یہ بات قابل غور ہے کہ علامہ کا اپنی تحریروں کے ذریعہ ایسے تاثرات مرحمت فرمانے کی کوشش کرنا اور ناظرین کا ایسے تاثرات قبول کر لینا کیا بیشتر حضرات مترجمین ومفسرین پر صریح ظلم نہیں ہے؟

گذشتہ سطور میں ہم نے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نیز مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی شہادتوں کی روشنی میں علامہ کی "علمی سطح" ناپ کر اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں کہ ان حضرات کے نزدیک علامہ کی پیمائش علم یہ ہے کہ :-

"علامہ کے علم کے بارے میں جو اندازہ ابتک انکے مضامین سے تھا انکا علم اس سے بہت کم ہے۔ خاصکر قرآن مجید کے بارے میں انکا علم وفکر بہت سطحی ہے"

کہیں ایسا تو نہیں کہ

علامہ مودودی بھی اپنی تفہیم لکھنے کے وقت بقول خود معانی قرآن کی اوپری سطح پر گھومتے رہے ہوں اور انھیں قرآن مجید کی گہرائی میں اُترنے کا راستہ نہ مل رہا ہو کیونکہ موصوف کے بیان کے مطابق جیسا کہ انکے دیباچہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی مذکورہ بالا شہادت سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے اپنی تفہیم نویسی ۱۹۴۲ کے لگ بھگ شروع کی تھی اور اسوقت موصوف کی علمی سطح وہی تھی جس کی تفصیل اوپر عرض کیجا چکی ہے تو ظاہر ہے کہ اسوقت تو علامہ خود بھی معانیٔ قرآن کی گہرائی تک نہ پہونچے ہونگے اور اوپری سطح پر ہی چکر کاٹتے رہ گئے ہونگے۔

بہرحال چونکہ علامہ کے نزدیک قرآن مجید کا "فہم وتدبر" اور اس سے "ہدایت پذیری" انکے اپنے تصنیف کردہ "مقدمۃ الکتاب" کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اس لئے موصوف اپنے مقدمۂ قرآن یا مقدمہ تفہیم کی مزید ضرورت واہمیت کو ثابت کرنے کیلئے ذرا اور کھلکر صاف صاف طور پر اپنی بات یوں پیش فرماتے ہیں

"پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو "موضوع" معلوم ہو مقصد ومدعا اور اس کے "مرکزی مضمون" کا علم ہو، اسکے انداز بیان سے واقفیت ہو، اسکی اصطلاحی زبان اور عبارت اور اسکے مخصوص طرز تعبیر سے شناسائی ہو اور اسکے بیانات اپنی ظاہری کے پیچھے جن احوال ومعاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے سامنے رہیں"

"ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیت لیکر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن شریف کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے "موضوع" اور "مرکزی مضمون" کا سراغ نہیں ملتا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم وبیش مستفید ہونے کے باوجود اصل کلام اللہ کی روح تک پہونچنے سے محروم رہ جاتا ہے"

قرآن مجید کی اصل روح کیا ہے؟

کلام اللہ کی اصل روح کیا ہے؟ اور اس تک رسائی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس پر روشنی تو انشاء اللہ ہم آئندہ ڈالیں گے اور قدرے تفصیل سے بتائیں گے کہ

قرآن مجید کی اصل روح " ہدایت " ہے اور یہ ہدایت علامہ کی تفہیم یا مقدمۂ تفہیم پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔ فی الحال تو اس طویل اقتباس کو آپ بار بار پڑھ جائیے آپ کو اس سے بس دو ہی تاثر حاصل ہونگے :-

(الف) "قرآن فہمی کیلئے بیحد ضروری ہے کہ قرآن مجید پڑھنے والے کو اس کے "موضوع" اسکے "مقصد و مدعا" اسکے "مرکزی مضمون" کا علم ہو۔ اسکے انداز بیان اسکی اصطلاحی زبان اسکے مخصوص طرز تعبیر سے واقفیت ہو اور جن احوال و معاملات کے سلسلہ میں آیات قرآنی کا نزول ہوا ہے وہ بھی نظر کے سامنے رہیں (جسے عرف عام میں شان نزول کہا جاتا ہے)۔

(ب) قرآن مجید عام کتابی اسلوب اور تصنیفی ترتیب کے مطابق نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی برسوں معانی قرآن کی سطح پر گھومتا رہتا ہے اور گہرائی میں اتر کر اصل کلام اللہ کی روح تک رسائی حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے"۔

یہ ہیں وہ دو تاثرات جو علامہ کے مندرجہ بالا اقتباس سے حاصل ہوتے ہیں۔

سوال ہوتا ہے کہ

جب بقول علامہ قرآن مجید کو صرف سمجھنے کیلئے کتنی ہی باتوں کا علم حاصل کرنا اور کتنی ہی چیزوں پر نظر رکھنا اسقدر ضروری ہے تو پھر قرآن مجید کو سمجھانے اور اسکی تفسیر لکھنے کے لئے کتنی علمی گہرائی اور ماہرانہ واقفیت کی ضرورت ہوگی۔ کاش ہمارے علامہ اپنے طول طویل مقدمہ میں کچھ روشنی اس پہلو پر بھی ڈالدیتے اور اپنے دیباچہ میں جن مترجمین و مفسرین کی تفسیری کاوشوں پر پانی پھیرنے کی کوشش فرمائی ہے تو اپنے اس مقدمہ میں ذرا ان حضرات کی علوم متعلقہ تفسیر سے واقفیت کو بھی زیر بحث لے آتے تو اچھا

Scanned with CamScanner

ہوتا کہ ناظر تفہیم کو ایک طرف جہاں علامہ کی مفسرانہ برتری کا احساس ہوتا وہیں دوسری طرف یہ بھی تو نظر آجاتا کہ تفسیر نویسی کے لئے کیا شرائط ولوازم ہیں اور اس اعتبار سے علامہ کس مقام بلند تک رسائی حاصل فرما سکے ہیں۔

مثال کے طور پر علامہ، حضرت شیخ الہندؒ وعلامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مولانا فتح محمد صاحب جالندھری وغیرہم کی مفسرانہ صلاحیتوں اور تفسیری کاوشوں پر بھی نقد فرمالیتے تو اچھا ہوتا اور تقابلی طور پر ہر ناظر تفہیم کو یہ بصیرت حاصل ہوجاتی کہ تفسیر قرآن لکھنے کیلئے واقعتاً کیا کیا شرائط ہیں اور تفسیر نگاری کیلئے کتنی مہارت اور حذاقت درکار ہوتی ہے اور وہ حضرات مفسرین اس میں کیا مرتبہ ومقام رکھتے تھے اور خود آنجناب جوان کے مصلح اعظم بنکر ہویدا ہوئے ہیں کس مقام تک رسائی رکھتے ہیں؟

یہ کہاں کا انصاف ہے؟

علامہ عام ناظر قرآن کو تو اپنے علمی تبحر سے مرعوب کرنے کے لئے یہ باور کرانے کیلئے کوشش پہ کوشش فرماتے جارہے ہیں کہ دیکھو!

"قرآن کا سمجھنا آسان نہیں ہے کیونکہ:۔

(الف) قرآن مجید دوسری کتابوں سے بہت مختلف ہے نہ تو اسمیں تصنیفی ترتیب ہے نہ کتابی اسلوب ہے، اسمیں کسی قسم کا ربط وتسلسل بھی نہیں ہے۔ یہ تو مختلف تنذرات ہیں جو مسلسل عبارت کی شکل میں یکجا کرکے لکھ دیئے گئے ہیں۔

(ب) قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اسکا موضوع ومدعا، مرکزی

مضمون، انداز بیان، اسکی اصطلاحی زبان مخصوص طرز تعبیر وغیرہ معلوم ہو بغیر اسکے قرآن مجید سمجھا نہیں جا سکتا، اسکی اصل روح تک رسائی نہیں ہو سکتی اسلئے جو شخص بھی قرآن مجید کو سمجھنا چاہتا ہو اسکی اصل روح اور گہرائی تک رسائی چاہتا ہو تو وہ صرف تفہیم القرآن ہی کے ذریعہ رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے دیباچہ میں جملہ تراجم وتفاسیر پر خط نسخ کھینچ دیا گیا ہے اور جس کے مقدمہ میں "قرآن فہمی" اور اس سے ہدایت پذیری کیلئے سارے اسباب فہم وتدبر جمع کر دیئے گئے ہیں کہ ابتو تا قیامت تک کسی دوسرے "ابو جہل" و"ابو لہب" یا "عاص بن وائل" اور "ولید بن مغیرہ" کے پیدا ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اب تفہیم القرآن پڑھکر ہر شخص حضرت عمرؓ و حضرت جبیرؓ بن سکتا ہے

اور جب معاملہ خود اپنا آگیا اور سوال ہوا تفسیر لکھنے اور قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے کا تو بات بدل دیگئی اور ناظرین کو اس بات کیلئے آمادہ کر لیا گیا کہ قرآن مجید کا جو مفہوم ومطلب علامہ کی سمجھ شریف میں آجائے بس وہی صحیح ہے اور گویا وہی مراد خداوندی بھی ہے۔ چنانچہ موصوف تفہیم القرآن" کے ابتدائی دور میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

"اس تفسیر میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھکر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے حتی الامکان جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں"

(ترجمان القرآن ص ۳ بابت محرم ۶۱ھ)

پھر یہی سلسلہ تفہیم جب علٰحدہ تفسیر وکتاب کی شکل میں شایع ہوا تو اسکے دیباچہ میں یہ عبارت بہت معمولی سی لفظی رد وبدل کے ساتھ یوں نقل ہوئی۔

Scanned with CamScanner

"میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں" (دیباچہ تفہیم طبع یازدہم ص۱۰)

اور ایک دوسری جگہ مسلمانوں کیلئے "جدید تعلیمی پالیسی" اور "لائحہ عمل" تجویز کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا ہے:۔

"قرآن کیلئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہوا اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو" (تنقیحات ص۲۱۲)

فتنہ کی نشان دہی

ممکن ہے بعض حضرات علامہ کے مندرجہ بالا ارشاد کی خطرناکی پوری طرح محسوس نہ فرمائیں اسلئے اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ علامہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو یونہی سوختنی قرار نہیں دے رہے ہیں کسی تفسیر کی حاجت نہ ہونے پر بلا کسی وجہ کے زور نہیں دے رہے ہیں بلکہ اسکے تحت موصوف کا مستقل ایک منصوبہ مضمر ہے وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح اپنے ناظر کا ذہن پہلے تو اس بات کیلئے تیار کر لیا جائے کہ "قرآن فہمی" کیلئے پرانی تفسیریں کسی درجہ میں بھی ضروری بلکہ قابل مطالعہ بھی نہیں ہیں اور اس طرح جب انکا اعتماد دوسری تمام تفسیروں سے اٹھ جائے تو اس وقت اپنی تفہیم القرآن اور قرآن کی آزاد ترجمانی پیش کر کے اپنے منصوبہ کو بروئے کار لایا جائے۔

تحریک مودودیت کا یہی وہ خطرہ وفتنہ ہے جسے علماء حق نے اپنی چشم بصیرت اور نور فراست سے محسوس کرلیا تھا اور اب سے بہت پہلے ہی جماعت کے متعلق اپنے ارشادات کے ذریعہ فریضۂ تبلیغ وہدایت ادا فرما چکے تھے

قرآن فہمی کے دو معیار کیسے؟

علامہ کے مندرجہ بالا ارشادات کی روشنی میں قرآن فہمی کیلئے دو مختلف ومتضاد قسم کے معیار سامنے آتے ہیں۔ یعنی قرآن مجید کے صرف مطالعہ کیلئے جو معیار علامہ نے پیش فرمایا ہے وہ تو اونچے درجہ کا اور ذرا مشکل معیار ہے کہ جب تک علامہ کا تصنیف کردہ مقدمۂ تفہیم (جو قرآن مجید کیلئے بطور مقدمۃ الکتاب تحریر فرمایا گیا ہے) نہ پڑھ لیا جائے اور اسکی مدد سے قرآن مجید کا "موضوع ومدعا" "مرکزی مضمون" اور "انداز بیان" "واصطلاحی زبان اور مخصوص طرز تعبیر" نہ سمجھ لی جائے۔ قرآن کی اصل روح تک رسائی اور اسکی گہرائی تک پہونچ بالکل ناممکن اور کسی طرح اس سے استفادہ اور ہدایت پذیری ہو ہی نہیں سکتی۔

اور جب قرآن مجید کی تفسیر لکھنے یا پڑھانے کا موقع ہو تو اسکے لئے دوسرا معیار جو مندرجہ بالا پہلے معیار سے بہت ہی پست درجہ اور آسان بھی ہے کہ "جس نے بھی اپنی دانست میں قرآن مجید کا مطالعہ بنظر غایر کیا ہو چاہے وہ کوئی صرف پروفیسر ہی ہو (یا پروفیسر بھی نہ ہو بلکہ اونچے درجہ کا صحافی وانشاء پرداز ہی ہو) وہ بھی خدا تعالیٰ کا ترجمان علامۃ القرآن ہو سکتا ہے اسکے لئے کوئی قید وشرط نہیں ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور یہ دو مختلف معیار کیسے ہیں؟ اور کیا واقعتاً بھی ایسا ہی ہے یا یہ کہ تفسیر قرآن اور مفسر قرآن کیلئے کچھ قیود وشرائط مقرر ہیں مگر علامہ انھیں نظر انداز فرما رہے

ہیں! اسکا جواب یہ ہے کہ حضرات علمار تفسیر نے اصولِ تفسیر اور تفسیر کی کتابوں میں مفسر کے آداب و شرائط لکھے ہیں اور تفسیر لکھنے والوں کیلئے انکی واقفیت اور پابندی ضروری قرار دی ہے

محقق اور معتمد علمائے کرام نے قرآن مجید کی ترجمہ و تفسیر کے وقت ان شرائط کو ملحوظ بھی رکھا ہے۔ باقی پروفیسر ٹائپ کے مفسرین جو کتب تفسیر و حدیث کے قدیم ذخیروں کو سوختنی و قلم زدنی سمجھتے ہوں اور خود انکی اپنی سمجھ شریف میں جو مطلب آجائے اسی کو قرآن شریف کی اصل ترجمانی سمجھتے ہوں تو ایسے لوگ علمائے حق کے نزدیک ضلوا و اضلوا کا صحیح مصداق ہیں۔

مفسر ہونے کے لئے کیا باتیں ضروری ہیں؟

حضرات علمار تفسیر نے اصول تفسیر کی کتابوں میں اور بعض مفسرین نے اپنی کتب تفسیر میں اس موضوع پر تفصیلی کلام فرمایا ہے اس موقع پر ہم علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ کی مشہور کتاب الاتقان فی علوم القرآن سے مفسر کے آداب و شروط نقل کرتے ہیں (واضح رہے کہ راقم السطور نے نقل کلام میں ترجمہ لفظی کے بجائے آزاد ترجمانی بلکہ تلخیص کا انداز اختیار کیا ہے تفصیلی ترجمہ میں غیر ضروری تطویل ہوجاتی)۔

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں:۔

"قرآن مجید کی تفسیر لکھنا صرف اس شخص کیلئے جائز ہے جو ان تمام علوم میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا ہو جنکی ضرورت ہر مفسر کو پڑتی ہے اور جنکا وہ محتاج ہوتا ہے اور ایسے علوم پندرہ ہیں جنکی فہرست نمبروار درج ذیل ہے۔" (ملاحظہ ہو اتقان از ص۱۸۰ تا ص۱۸۱)

(۱) عربی لغت: (عربی زبان و ادب) سے پوری واقفیت ضروری ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ "کسی ایسے شخص کیلئے جو خدا تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو یہ بات حلال نہیں کہ وہ کتاب اللہ کے سلسلہ میں کچھ بات بھی کرے جبتک وہ لغات عربی کا پورا عالم نہ ہو" (جب بات کرنے کی اجازت نہیں تو تفسیر لکھنا کیسے جائز ہوگا)۔

امام بیہقیؒ شعب الایمان میں حضرت امام مالک علیہ الرحمہ سے نقل فرماتے ہیں کہ "اگر میرے سامنے کوئی شخص لایا جائے جو لغات عربی (عربی زبان وادب) کا پورا علم نہ رکھتے ہوئے کتاب اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اسکو سزا ہی دونگا"۔

(۲) علم نحو (عربی قواعد کا ایک حصہ جسمیں جملہ کی ترکیب و ساخت سے متعلق قواعد بتائے گئے ہیں) سے بھی واقفیت مفسر کے لئے ضروری ہے ورنہ اعراب کی غلطی سے کلام اللہ کے معنی متعین کرنے میں بھی غلطی واقع ہو جائیگی۔

(۳) علم صرف (عربی قواعد کا ایک دوسرا حصہ جس میں افعال کے صیغے اور انکے اوزان وغیرہ سے بحث ہوتی ہے) سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ ابن فارسی کہتے ہیں کہ "جس شخص کو علم صرف نہ آیا اسے علم کا ایک بڑا حصہ نہ آیا"۔

(۴) علم اشتقاق (علم صرف کا ایک شعبہ ہے جس میں یہ بحث ہوتی ہے کہ کونسا لفظ کس مادہ سے مشتق ہے) جاننا بھی ضروری ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی لفظ دو مادّوں سے مشتق ہوتا ہے اور ہر مادہ کے لحاظ سے اسکے ہر دو معنی میں بڑا فرق ہو جاتا ہے لہٰذا مفسر اگر علم اشتقاق سے ناواقف ہوگا تو غلطی کر جائیگا (خاصکر پروفیسر ٹائپ مفسر کیونکہ وہاں یہ علوم بار نہیں پاتے) مثلاً "مسیح" کا لفظ ہے مفسر کو اسکی تعیین کرنی ہوگی کہ یہ "مسح" سے مشتق ہے (م حروف اصلیہ میں داخل ہے) یا

وسیاحت ؛ سے مشتق ہے (میم زائدہ ہے)

(۵-۶-۷) علم معانی و بیان اور علم بدیع (کہ علم معانی سے ترکیب کلام کی خصوصیات معلوم ہوتی ہیں اور علم بیان سے کلام کے معانی کی وضاحت وغیرہا معلوم ہو جاتی ہے اور علم بدیع سے کلام کی لفظی و معنوی صنعتیں معلوم ہوتی ہیں اور یہ تینوں "علم بلاغت کہلاتے ہیں جو تفسیر کلام اللہ کے سلسلے میں عظیم الشان رکن کی حیثیت رکھتے ہیں) مفسر کیلئے ان علوم میں بھی مہارت ضروری ہے۔

(۸) علم قراءة کا جاننا بھی مفسر کیلئے ضروری ہے کیونکہ اسکی وجہ سے الفاظ قرآنیہ کا صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے اور بعض قراتیں دوسری قرارتوں سے بہتر ہوتی ہیں جن سے معنی مرادی کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

(۹) علم اصول دین (علم عقائد) سے بھی واقفیت ضروری ہے کیونکہ قرآن میں بعض آیات ایسی ہیں جنھیں اگر انکے ظاہری معنی پر رکھا جائے تو اسکا اطلاق اللہ تعالے کیلئے ناجائز و ناروا ہو جاتا ہے لہٰذا ایسی آیتوں کی تاویل کرنا اور انکے مناسب معنی متعین کرنا ضروری ہے۔ اس مقصد کیلئے علم عقائد کی واقفیت ضروری ہے۔

(۱۰) علم اصول فقہ کی واقفیت بھی ضروری ہے کیونکہ اسی علم کی بدولت شرعی احکام کے استنباط و استدلال کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱۱) علم اسباب نزول یعنی آیات قرآنی کا پس منظر معلوم ہونا اور ان حالات و معاملات پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے جن میں وہ آیات متعلقہ نازل ہوئی ہوں۔

(۱۲) علم ناسخ و منسوخ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کونسی آیت پر عمل منسوخ ہو گیا ہے اور کونسی آیات اسوقت بھی محکم اور واجب العمل ہیں۔

(۱۳) علم فقہ (علم مسائل واحکام) سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

(۱۴) علم حدیث سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ اسکے ذریعہ مجمل ومبہم آیات کی تفصیل وتعیین ہوجاتی ہے۔

(۱۵) علم موہبت وعلم لدنی مفسر کو اس سے بھی بہرہ ور ہونا چاہیئے اور یہ وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ان علماء کو مرحمت فرماتے ہیں جو اپنے علم پر عمل بھی کرتے ہوں جسکی طرف حدیث شریف میں اشارہ موجود ہے کہ جو شخص اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم کا وارث بنا دیتے ہیں جنکا علم اسکو نہیں ہوتا۔

شاید آپکو یہ بات مشکل نظر آئے

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ ان پندرہ علوم سے واقفیت شرط قرار دینے کے بعد خود ہی ایک اشکال پیش کر کے اسکا جواب بھی مرحمت فرما دیتے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ "علم وہبی" اور "علم لدنی" کا حصول اپنے اختیار و قدرت میں تو ہے نہیں ایسی صورت میں مفسر کیلئے علم وہبی کا حصول بھی شرط قرار دینا کوئی معقول بات نہیں ہے لہٰذا اسکو شرط قرار نہ دینا چاہیئے تھا، جواب یہ ہے کہ بظاہر تو یہ بات مشکل ہی نظر آتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ علم وہبی اور علم لدنی بظاہر تو غیر اختیاری ہی ہیں لیکن یہ اسطرح اختیاری بھی ہو سکتے ہیں کہ علم صالح اور زہد وتقویٰ کے ذریعہ وہ صلاحیت حاصل کیجا سکتی ہے جسکی بدولت علم وہبی اور علم لدنی کی دولت عطا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی "البرہان للناظر فی القرآن" میں فرماتے ہیں:۔

"کسی ناظر قرآن کو معانی وحی و مطالب قرآن مجید کا فہم صحیح اسوقت تک حاصل

ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی اسکے اسرار و رموز ہی اسپر منکشف ہوتے ہیں جس کے دل میں مندرج ذیل باتوں میں سے کوئی بات موجود ہو:—

(الف) وہ کسی فکری و خیالی یا عملی بدعت میں مبتلا ہو

(ب) وہ جذبۂ کبر و احساس انا کا مریض ہو۔

(ج) وہ خواہش نفس کی پیروی میں مبتلا ہو۔

(د) وہ حُبِّ دنیا کا شکار ہو

(ہ) وہ کسی معصیت کا اصرار کے ساتھ مرتکب ہو۔

(و) اسکا اصل ایمان ہی ضعیف و کمزور اور غیر تحقیقی ہو

(ز) اسکی تحقیق ہی میں ضعف و خامی پائی جاتی ہو

(ح) وہ کسی ایسے مفسر کے اقوال پر اعتماد رکھتا ہو جو تفسیر کے صحیح علم سے تہی دست ہو یا ایسی تفسیر کرتا ہو جو صرف عقل پر مبنی ہو نقل کی تائید حاصل نہ ہو" (اتقان ص ۱۸۱ ج ۲)۔

علامہ زرکشیؒ کا مندرجہ بالا قول نقل کرنے کے بعد خود علامہ سیوطیؒ ارشاد فرماتے ہیں:—

یہ مضمون قرآن مجید کی اس آیت سے بھی بطور تائید لیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (میں اپنی آیات سے ان لوگوں (کے دلوں) کو پھیر کر دور ہی رکھونگا جو زمین میں ناحق تکبر و غرور کرتے ہیں)۔ یہ آیت شریفہ اگرچہ کفار و معاندین کے حق میں ہے لیکن ایسے لوگ اسکا مصداق قرار دیئے جا سکتے ہیں جو اپنے احساس "انا" اور جذبۂ کبر و عجب کی بنا پر سلف کو نظر انداز کرتے اور براہِ راست قرآن فہمی کیلئے سرگرداں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر

فہم قرآن کے راستے نہیں کھولتے۔

تفسیر نویسی کیلئے صحیح طریق

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ اسی اتقان میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"علماء تفسیر فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن مجید کی تفسیر کرنا چاہے تو اس سلسلہ میں وہ سب سے پہلے قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کرے اور اسی کی مدد سے تفسیر کرے کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات جو قرآن مجید میں ایک جگہ مجمل ومبہم ذکر کی گئی ہے دوسری جگہ وہی بات مزید تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے اور اگر وہ صرف تفسیر بالقرآن سے کام نہ چلا سکے تو کتاب اللہ کی تفسیر حدیث وسنت سے کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ (غور سے یہ بات سن لو کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اسکے ساتھ اتنا ہی ذخیرہ اور دیا گیا ہے) پھر اگر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تفسیر کیلئے کافی نہ ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کیطرف رجوع کرے کہ وہ حضرات قرآن مجید کے معانی ومطالب سے زیادہ باخبر ہیں کیونکہ ان حضرات نے نزول قرآن کے وقت جو حالات درپیش تھے انکا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اور اسلئے بھی کہ وہ حضرات فہم کامل اور علم صحیح اور عمل صالح کے خصوصی طور پر جامع تھے چنانچہ محدث حاکم نے اپنی مستدرک میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایسے صحابی کی تفسیر جو نزول قرآن کے وقت موجود رہے ہوں اور وحی انکی موجودگی میں نازل ہوئی ہو وہ تفسیرات بھی حدیث مرفوع کے حکم میں ہیں علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر کے شروع میں مفسر کے آداب تحریر فرمائے

ہیں جنہیں ہم علامہ سیوطیؒ کی اتقان سے بطور تلخیص و اختصار یہاں نقل کرتے ہیں،
فرماتے ہیں:۔

آداب مفسر پر گفتگو، یعنی مفسر کو کیا ہونا چاہیئے؟

معلوم ہونا چاہیئے کہ مفسر کیلئے سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ:۔

(۱) اس کے عقائد درست ہوں (عقیدۂ اہل سنت والجماعت کے مطابق عقیدہ رکھتا ہو۔

(۲) وہ دین کے مقررہ طریقہ کا پابند ہو کیونکہ جو شخص اپنے دینی معاملہ میں متہم اور ناقابل اعتبار ہوتا ہے تو ایسے شخص پر تو دنیاوی معاملات میں اطمینان و اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جاتا تو پھر کسی دینی معاملہ میں اس پر کیسے اطمینان و اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

کسی دینی معاملہ میں اگر ایسا شخص کسی دوسرے عالم ہی کی طرف سے کوئی خبر دیتا ہو تو اس پر وثوق نہیں کیا جا سکتا تو ایسی صورت میں جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رموز و اسرار کی خبر دے رہا ہو اور کلام اللہ کی مراد متعین کر رہا ہو کس طرح ایسے شخص پر اعتماد و یقین کیا جا سکے گا۔

علاوہ ازیں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایسا شخص جو کسی قسم کی بے دینی اور بے راہ روی سے متہم اور بدنام ہو تو ایسے شخص کے سلسلہ میں اس اندیشہ و خطرہ سے اطمینان کی صورت کیا ہوگی کہ وہ شخص اپنی تفسیر کے ذریعہ لوگوں کو "دینی آزمائش" میں مبتلا کر رہا ہو اور اپنی "پُر فریبی" اور "کج بحثی" سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈال رہا ہو جیسا کہ "فرقہ باطنیہ" اور "فرقہ رافضیہ" کے تفسیر نگاروں نے پہلے زمانے میں کیا ہے (اور علامہ مودودی نے بھی یہی خدمت اس

زمانہ میں انجام دینی چاہی ہے)۔

اور اگر یہ مفسر قرآن خواہش نفس کی پیروی کا شکار ہوگا تو اسکی تفسیر میں یہ خطرہ بھی رہے گا کہ اسکا جذبۂ اتباع ہویٰ (پیروی خواہش نفس) اسکو اس بات پر آمادہ و تیار کرتا رہیگا کہ موقع بموقع قرآن مجید کو اپنی بدعات اور محدث و خود تراشیدہ افکار و نظریات کی تائید میں پیش کرکے اپنے نظریہ و تحریک کی ترویج و اشاعت میں استعمال کرتا رہے گا جیسا کہ "فرقۂ قدریہ" کے لوگوں نے پہلے کیا ہے۔ یہ لوگ تفسیری کتابیں لکھتے تھے جن انکا مقصد ہرگز ہرگز قرآن مجید کیلئے فہم و تدبر کی راہیں کھولنا نہ ہوتا تھا بلکہ انکا مقصد و مدعا صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ بالکل خاموش طور پر اپنی تفسیر و ترجمانی کے ذریعہ لوگوں کو "پیروی سلف" اور طریقۂ ہدایت سے روک کر اس سے دور کردیں۔

(۳) تیسری شرط مفسر کیلئے یہ ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی تفسیرات و تشریحات پر اعتماد رکھے ان سے ہی استفادہ کرے۔ محدث افکار و نظریات سے علٰحدہ و کنارہ کش رہے پھر تفسیری منقول روایات اگر مختلف ہوں اور انہیں باہم جمع و تطبیق ممکن ہو تو جمع و تطبیق ہی سے کام لیکر کسی جامع مفہوم سے تفسیر کرلے اور اگر چاہے تو ان مختلف تفسیری اقوال میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرسکتا ہے۔

(۴) چوتھی شرط مفسر کیلئے یہ ہے کہ مفسر کا مقصد بھی اپنی تفسیر نگاری سے صحیح ہی ہونا چاہئے کہ مفسر اپنی کوشش میں "کامیاب" اور "صحیح معنی میں" راہ یاب" بھی ہوسکے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (اور جن لوگوں نے ہمارے لئے محنت و مشقت جھیلی ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں)

اور یہ بات کہ انسان صرف لوجہ اللہ ہی کوئی کام کرے تو یہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان "دنیا طلبی" سے خالی ہو کیونکہ جس شخص میں خلوص وللّٰہیت کی جگہ خود غرضی یا شہرت طلبی وغیرہ کا جذبہ موجود ہوتا ہے تو اسکے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ایسے کاموں میں درپردہ کوئی ایسی غرض نہ ہو جو اسے صحیح راہ سے دور کر دے"

(اتقان ص۱۷۵ و ص۱۷۶ مختصراً)

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے

علامہ سیوطیؒ کی کتاب اتقان سے جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں ان پر غور فرمایا جائے تو بڑی آسانی سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور علامہ مودودی نے قرآن فہمی اور تدبر قرآن کی راہیں کھولنے کے نام پر تفہیم القرآن میں جو آزاد ترجمانی اور تفسیر نگاری فرمائی ہے وہ تاریخ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے ان کے بہت سے پیش رو بھی اسی طرح "تشنگی بجھانے کی خدمات" انجام دے چکے ہیں

روش مفسرین کے برعکس علامہ کا توسع

قرآن فہمی اور تفسیر نگاری کے سلسلے میں علامہ کے مقرر فرمائے ہوئے دو معیار جو اوپر پیش کئے جا چکے ہیں انکی معقولیت مزید آشکارا و وانشگاف کرنے کیلئے "اتقان سیوطی" کے مندرجہ بالا طویل اقتباسات پیش کرنے ضروری سمجھے گئے کہ حضرات ناظرین انکی روشنی میں کھلی آنکھوں ملاحظہ فرمالیں کہ حضرات مفسرین نے تفسیر نگاری کیلئے کیسی کیسی قیدیں اور شرطیں تحریر فرمائی ہیں اور انکی روش کے بالکل برعکس علامہ نے کیسی فراخدلی اور توسع

کام لیتے ہوئے تفسیر نگاری کا حق ادا کیا ہے اسکے برعکس محققین علمائے راسخین سے چھین کر کالج کے پروفیسروں، صحافیوں اور انشاپردازوں کو مرحمت فرما دیا ہے اور پروفیسر بھی ایسا جسے نصاب قدیم کی ہوا بھی نہ لگی ہو جیسا کہ تنقیحات کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا کہ موصوف فرماتے ہیں کہ

"قرآن کیلئے کسی تفسیر کی (چاہے وہ علامہ کی تفہیم القرآن ہی کیوں نہ ہو) حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے (افسوس کہ علامہ کے نزدیک طبقۂ علماء میں کوئی بھی لائق اعتنا اور قابل توجہ نظر نہ آسکا) جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو وہ اپنے "لکچروں" سے "انٹرمیڈیٹ" میں طلباء کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کر دیگا۔

(تنقیحات ص ۲۱۲)

اسی تنقیحات میں ——— ایک دوسرے مقام پر یوں بھی ارشاد فرما چکے ہیں:۔

"قرآن و سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے "پرانے ذخیروں" سے نہیں" (تنقیحات ص ۱۲۶)

علامہ کا کمال دوراندیشی

اقتباس بالا میں علامہ نے نہایت ہی ہوشمندی و دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے تفسیر و حدیث کے "پرانے ذخیروں" کا فقرہ استعمال فرمایا ہے جو بیحد مبہم ہے کسی کیلئے یہ تعیین مشکل ہے کہ علامہ کے نزدیک اس پرانے ذخیرہ کا مصداق کونسی کتابیں ہیں؟

Scanned with CamScanner

علامہ موصوف نے اپنی تفہیم نگاری میں جن کتب تفسیر سے استفادہ فرمایا ہے وہ اس "پرانے ذخیرے کے ریمارک" میں آتی ہیں یا نہیں؟ یا پھر یہ سمجھا جائے کہ موصوف نے اپنی تفہیم میں پرانے ذخیرہ سے مطلق استفادہ نہیں فرمایا اور انکی یہ تفہیم مکمل طور پر انکی "خود فہمی" کا نتیجہ ہے۔

ناظرین کرام توجہ فرمائیں!

تنقیحات کی عبارت مندرجہ بالا بغور ملاحظہ فرمانے کی ضرورت ہے کہ علامہ نے کس صفائی سے تفسیر و حدیث کے تمام ہی "پرانے ذخیروں" کو دریا برد کر دینے کا مشورہ مرحمت فرمایا ہے اور تفسیر و حدیث کی جملہ کتب کو "بیک قلم" ناقابل اعتبار قرار دیدیا ہے۔

یہ عبارت کیسی سخت اور یہ انداز تحریر کس قدر غیر محتاط ہے کہ غیر معتبر اور غیر مستند کتابوں کے ساتھ ساتھ معتبر و مستند ذخیرہ کتب کو بھی اپنے اشہب قلم کی جولانی میں گھائل کرتے چلے گئے | شعر۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

مقصد یہ ہے کہ ادراک بس صرف "تفہیم القرآن" ہی چل سکے اور مفسرین کرام کے "درس تفسیر" کے بجائے مودودی پروفیسروں کے "تفسیری لکچر" ہی چلیں۔

تفہیم القرآن کیسے وجود میں آئی

اب کسی کی مجال ہے جو علامہ سے یہ دریافت کر سکے کہ جناب والا جب

تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیرے یکسر ناقابل استفادہ اور نالائق اعتبار ہیں تو آپ کی یہ تفہیم القرآن کیسے وجود میں آئی؟ آپ نے بھی تو شاید تفسیر کے پرانے ذخیروں ہی سے "خوشہ چینی" فرمائی ہوگی؟ یا پھر آپ کی یہ تفہیم القرآن آپ کی طبعزاد "تفسیر" اور "تفسیر بالرائے" ہے؟ ہمارا حسن ظن ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم یہ سمجھیں کہ تفسیر بالرائے سے ممانعت پر مشتمل احادیث کو نظر انداز فرماتے ہوئے علامہ نے اسکی جسارت فرمائی ہوگی اور ایسی سخت وعیدوں سے صرف نظر فرمالیا ہوگا۔ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے (۱) مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِهٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (مشکوٰۃ شریف) (جس نے قرآن شریف کا مطلب صرف اپنی رائے سے بیان و متعین کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) (۲) مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِهٖ فَقَدْ اَصَابَ فَقَدْ اَخْطَأَ (مشکوٰۃ شریف) جس نے قرآن مجید کی تفسیر میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ صحیح بھی کہا پھر بھی اس نے غلط کام کیا) مطلب یہی ہے کہ اپنی رائے سے تفسیر کرنے پر صحیح مطلب تک رسائی پانے والے کو بھی خطا کار ہی کہا جائے گا۔ ان احادیث کے پیش نظر علامہ کی یہ طبعزاد تفہیم انھیں کس صف میں کھڑا کر رہی ہے اسکا فیصلہ حضرات ناظرین خود ہی فرمالیں تو بہتر ہوگا لیکن فیصلہ سے پہلے یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ علامہ موصوف احادیث شریف سے متعلق بھی ایک خاص ذہن رکھتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ہم آپ تو کسی حدیث کو اسکی سند کے اعتبار سے بہت مستند اور قابل یقین و عمل سمجھتے ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ علامہ بھی اسکو ایسا ہی سمجھ لیں، کیونکہ موصوف روح دین و مذہب تک اپنی رسائی اور نبوت و رسالت کی مزاج شناسی کے باعث اس مقام بلند تک پہونچ چکے ہیں "جہاں پہونچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔۔۔۔ اور بسا اوقات

وہ غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے (ملاحظہ ہو تفہیمات حصہ اول ص ۳۲۴)۔

چوں بخلوت می روند

اور اگر علامہ نے اپنی تفہیم میں تفسیر بالرائے اور طبع زاد مطلب سے کام نہیں لیا بلکہ انھیں پرانے ذخیروں سے استفادہ فرمایا ہے جنکے متعلق " منبر کی جلوہ فرمائی کے وقت دوسروں کو ممانعت فرمادی تو یہ بات بھی اعتراض سے کب خالی ہے؟

ازراہ کرم ہمیں بتایا جائے

یہ کہاں تک مناسب ہے کہ علامہ موصوف ایک طرف تو بر سر منبر جلوہ فرما ہو کر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو شجر ممنوعہ قرار دیدیں اور دوسروں کو ان سے پرہیز کی تلقین کریں اور دوسری طرف خلوت میں جب "تفہیم القرآن" لکھنے کی نوبت آئے تو خود اسی شجر ممنوعہ کے پھل کھائیں اور انھیں پرانے ذخیروں سے "خوشہ چینی" کرتے ہوئے اپنے ناظرین کیلئے مضامین نو کے انبار بھی لگا دیں اور انھیں یہ تاثر دینے کی کوشش جاری رکھیں کہ تفہیم القرآن میں جو حقائق و دقائق پیش فرمائے گئے ہیں اور کلام الٰہی کے جن اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہ سب علامہ کی جودت طبعی اور ذکاوت عقلی کا نتیجہ ہے۔

اگر کسر شان نہ ہو

علامہ اگر اپنی شان کے خلاف تصور نہ فرمائیں تو آئندہ تفہیم کے ایڈیشن میں بھی

وضاحت فرمادیں کہ انھوں نے اپنی تفہیم القرآن میں "پرانے ذخیرۂ تفسیر (تفسیر طبری تفسیر ابن عربی، تفسیر ابن کثیر اور زمخشری و ابو مسلم اصفہانی کی تصنیفات نیز سید قطب کی فی ظلال القرآن) سے مطلق استفادہ نہیں فرمایا ہے اور قرآن مجید سے متعلق جغرافیائی معلومات میں علامہ سید سلیمان ندوی کی ارض القرآن یا تفسیر حقانی کی تحقیقات تفسیری سے بھی کوئی مدد نہیں لی ہے اور تفہیم القرآن کی ساری جغرافیائی تحقیقات ان کی ذاتی کاوش اور جد و جہد کا نتیجہ ہیں اور یہ جد و جہد بھی صرف تفسیر نویسی ہی کے لئے فرمائی گئی تھی سیر و سیاحت کا ذوق و شوق مطلق شامل نہ تھا جیسا کہ جماعت کے افراد اپنے حلقہ میں شہرت دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علامہ نے ان مقامات پر تشریف لیجا کر بذات خود وہ معلومات فراہم فرمائی ہیں جنکی واقفیت کسی درجہ میں بھی تفسیر کیلئے انھوں نے ضروری سمجھی ہے، چنانچہ تفہیم القرآن میں جن جن مقامات کا نقشہ اور جغرافیہ پیش کیا گیا ہے وہ سب موصوف کے ذاتی اور چشم دید مشاہدہ کا نتیجہ ہے

قرآن مجید کی اصل روح تفہیم القرآن میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن اور صرف قرآن میں ہے۔

گزشتہ صفحات میں جہاں ہم نے مقدمۂ تفہیم کے ص۱۵ سے تیسرا اقتباس نقل کیا تھا وہاں ہم نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آئندہ ہم اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالیں گے کہ قرآن مجید کی اصل روح "ہدایت پذیری" ہے جو خود قرآن مجید ہی میں موجود بھی ہے اور اگر خود انسان کی چشم بصیرت پر پردہ نہ پڑا ہو تو قرآن مجید کی کوئی تعلیم کسی حجاب یا پردہ میں مستور بھی نہیں ہے جیسا کہ علامہ کو غلط فہمی ہو گئی ہے چنانچہ وہ اپنی ایک دوسری

مشہور تصنیف میں تحریر فرماتے ہیں :-

"بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (الہ - رب - دین عبادت) کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا (چند سطروں کے بعد) نتیجہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو گیا۔"

(چند سطروں کے بعد غلط فہمی کے نتائج کے زیر عنوان فرماتے ہیں)

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی" (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۱۱ تا ۱۳)

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

علامہ کے مندرجہ بالا ارشادات کو بار بار غور سے پڑھیئے اور ذرا ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی کوشش کیجئے کہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں سے لیکر اب تک کتنی مدت گزر گئی اس مدت میں جو امت قرآن مجید کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح سے محروم رہی ہو اسکی سلامتئ اسلام و ایمان اور درستی اعمال کا کیا اطمینان ؟

علامہ نے ایسی ہی تعبیرات اپنے خطبات میں بھی اختیار فرمائی ہیں اور اپنے ذہن و فکر کے خلاف دوسروں کو غیر مسلم، غیر مؤمن اور کافر تک قرار دیدیا۔ ان تحریرات

کے خلاف جب مختلف حلقوں سے آوازیں اٹھائی گئیں تو صرف یہ فرماکر چھٹی پا گئے کہ وہ خطبات فتوے کی کتاب نہیں ہیں (یعنی ان میں صرف زور قلم کی نمائش فرمائی گئی ہے دین و مذہب اور فتوے کی اصطلاحات شرعی سے اسکا تعلق نہیں ہے) بہر حال ہم علامہ پر یہ الزام تو نہیں لگا سکتے کہ موصوف نے نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں آنے والے لوگوں کو قرآن مجید کی تین چوتھائی تعلیم سے غفلت و تجاہل کی بنیاد پر کافر ہی قرار دیدیا کیونکہ اگر ہم علامہ کی اس منطق کو جوں کا توں تسلیم کرلیں تو اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ امت محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام کا طبقہ عوام ہی جاہل و کافر قرار پائے گا بلکہ نزول قرآن کے بعد کی صدیوں میں ہونے والے تمام علما تفسیر قرآن مجید کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیمات سے غافل وجاہل ٹھہریں گے اسلئے ہم اتنی بات تو ضرور ہی سمجھنا چاہیں گے کہ علامہ کی اس نرالی منطق کے بعد ہمارے لئے اس بات کا اطمینان کیسے ہو کہ بعد کی صدیوں کے لوگ جنھیں تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح پہونچ ہی نہ سکی وہ لوگ دنیا سے اپنا ایمان صحیح سلامت لے گئے!

علامہ کے اس ارشاد پر مولانا ندوی کا تبصرہ ملاحظہ ہو

حضرت مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم نے علامہ کے ان ارشادات پر نہایت متوازن ومعتدل اور جچا تلا تبصرہ فرمایا ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

"اس (علامہ مودودی کی تحریر) سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں یہ کتاب (قرآن مجید) غفلت وجہالت کی نذر رہی اسکے حقائق کو سمجھا نہیں جاسکا اور نزول قرآن کے تھوڑی ہی مدت کے

بعد اس سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہوگیا (چند سطروں کے بعد) غور و فکر کا یہ انداز جسے "بعض مفکرین" اور "انشاپرداز" اختیار کر رہے ہیں اس ابدی اور انقلاب آفریں صلاحیتوں اور کارناموں سے بھرپور امت پر ایک طویل المیعاد فکری قحط اور ذہنی و عملی تعطل کا الزام عائد کرتا ہے (چند سطروں بعد) یہ نتیجہ اگرچہ بادی النظر میں کچھ زیادہ اہم اور سنگین نہ معلوم ہو لیکن اسکے اثرات ذہن و دماغ اور طرز فکر پر بڑے گہرے اور دور رس ہیں اس سے امت کی گزشتہ تاریخ اور مجددین مصلحین و مجتہدین کے علمی اور عملی کارنامے بھی مشکوک اور کم قیمت ہو جاتے ہیں (چند سطروں کے بعد) اس طرز تحقیق اور طرز کلام سے منطقی طور پر یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ امت پر ایک ایسا طویل دور گزرا ہے جب وہ قرآن کے ایسے اہم بنیادی اصطلاحات کے صحیح مفہوم اور منشا سے نا آشنا رہی ہے" (منصب نبوت اور اسکے عالیمقام حاملین)

عالمی سطح پر مولانا کی یہ شہادت بھی
علامہ کے خلاف نوٹ کر لی جائے

مولانا ندوی کے مندرجہ بالا تبصرہ میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ مولانا ندوی اس مقام پر علامہ کو نہ تو عالم و فاضل فرما رہے ہیں نہ مفکر و محقق بلکہ دور حاضر کے بعض مفکرین اور انشاپرداز کے خوشنما الفاظ سے یاد فرما رہے ہیں اور پھر کس لطیف انداز میں علامہ کو اس ابدی اور انقلاب آفریں صلاحیتوں اور کارناموں سے بھرپور امت کی

اور اس پر مولانا ندوی کا معتدل و متوازن تبصرہ پیش ہو چکا ہے اس سلسلہ میں راقم السطور کو بھی ایک خلش کا اظہار کرنا ہے وہ یہ کہ جب بقول علامہ" بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک لفظ اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا" یا " قرآن مجید کی ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی" ـــــ ایسی صورت میں خود علامہ موصوف پر ان بنیادی اصطلاحوں کا حقیقی مفہوم کہاں سے القا ہوا؟ اور انکی حقیقی روح علامہ کے روبرو کیسے بے نقاب ہو گئی؟ کاش علامہ اس سلسلہ میں اپنے ذریعۂ علم پر بھی کچھ روشنی ڈالدیتے تو ہم جیسے ناظرین و ناقدین کو بھی کچھ اطمینان ہو جاتا۔

رجوع الی المقصد

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں کا تذکرہ اور اس پر حضرت مولانا ندوی کا تبصرہ تو ضمناً آ گیا تھا ورنہ اصل بحث تو "مقدمہ تفہیم" پر چل رہی تھی۔ مقدمہ تفہیم میں علامہ کا سارا زور قلم صرف اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ لوگوں کی رسائی قرآن مجید کی اصل روح (ہدایت پذیری) تک اسلئے نہیں ہو پا رہی ہے کہ انھیں ابتک مقدمہ تفہیم کے نادر مباحث پڑھنے کو نہ مل سکے تھے اور علامہ جیسا رئیس التحریر و امیر القلم انشا پرداز میسر نہ ہو سکا تھا اور جبکہ علامہ نے مقدمہ تفہیم لکھکر قرآن کی روح تک رسائی آسان کر دی ہے تو لوگوں کو چاہیئے کہ وہ بھی تفہیم تک پہونچنے کیلئے صرف انکی تفہیم ہی کا مطالعہ کریں۔

خردہ گیری ہمارا مقصد نہیں ہے

ہمارا مقصد علامہ کی خردہ گیری ہرگز نہیں ہے لیکن اگر واقعہ یہی ہے کہ علامہ سچ مچ کچھ اسی قسم کی خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہیں تو ہمیں افسوس بھی ہے اور انکے ساتھ ہمدردی بھی۔

علامہ اور ان جیسے دوسروں کو یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید سے "ہدایت پذیری" اور اس کی "اصل روح" اور نفس مفہوم تک رسائی معاذ اللہ منہ کسی صحافی کے "زور قلم" اور کسی مفکر کی "صلاحیت تفہیم" پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔

قرآن مجید کے فہم و تدبر کی راہیں اللہ کے بندوں پر ہمیشہ کھلی رہی ہیں اور اس سے ہدایت پذیری کے دروازے کسی دور میں بھی انسانوں پر بند نہیں ہوئے اصل کلام الٰہی ہو یا اسکی شرح حدیث رسول ہو ان دونوں میں سے کسی پر بھی کوئی دورِ غفلت اور زمانۂ فترت نہیں گزرا ہے۔

قرآن مجید کس طرح دل کی گہرائیوں میں اترتا ہے

علامہ کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے کہ "قرآن فہمی" انکی تفہیم پر موقوف نہیں ہے بلکہ قرآن مجید سے اثر انگیزی اور ہدایت پذیری کے واقعات تاریخ اسلام کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں جنمیں سے صرف چند واقعات اپنی بات کی تائید میں مختصر طور پر ہم یہاں نقل کرتے ہیں :۔

Scanned with CamScanner

۱۔ قرآن اور حضرت عمر فاروق رضؓ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہاں تو مسلمان ہونے سے پہلے دین اسلام کے سخت مخالف تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور معاذ اللہ آپ کے قتل ہی کیلئے جارہے تھے جب راستہ میں یہ خبر ملی کہ آپ کی بہن فاطمہ اور بہنوئی مسلمان ہوگئے ہیں تو انکے گھر کا رخ کرلیا اور وہاں پہونچکر دونوں کو بری طرح مارا پیٹا آخر سورہ طٰہٰ کی چند ابتدائی آیات جب پڑھنے میں آئیں تو دل کی کایا ہی پلٹ گئی اور فوراً ہی خدمت اقدس میں حاضر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

۲۔ حضرت جبیر بن مطعم رضؓ اور قرآن

حضرت جبیر بن مطعم یوں تو طبعاً نیک مزاج اور سلیم الطبع شخص تھے لیکن مذہبی عصبیت "عصبیۃ جاہلیۃ" قبول حق اور قبول اسلام سے رکاوٹ بن رہی تھی جنگ بدر کے بعد اپنے کسی قیدی کو چھڑانے کیلئے مدینہ طیبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نماز میں مشغول تھے اور سورہ طور کی یہ آیات تلاوت فرمارہے تھے :۔

(ترجمہ) "طور کی قسم اس کتاب کی قسم جو لکھی ہوئی ہے اوراق میں اور آباد گھر چھت کی قسم اور ابلتے ہوئے دریاؤں کی قسم! بیشک تمھارے رب کا عذاب آکے رہیگا اور اس وقت کوئی بھی نہ ٹال سکے گا۔"

حضرت جبیرؓ بھی پاس کھڑے ہوئے تھے تھوڑی دیر میں (انھیں کے کہنے کے مطابق) انھیں ایسا لگا جیسے انکا دل ہی پھٹ جائے گا اور جب آپؐ سے خط کشیدہ فقروں والی آیت پڑھی تو ان پر کپکپی طاری ہوگئی کہ کہیں اسی وقت تو اللہ کا وہ عذاب نازل نہ ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اسی وقت ایمان لے آئے رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ۔ (قرآن نمبر سیارہ ڈائجسٹ ص۱۴۳)

(بخاری شریف کتاب التفسیر میں حضرت جبیرؓ کے قبول اسلام کا واقعہ اس سے کچھ مختلف طور پر ذکر کیا گیا ہے اور سورۂ طور کی دوسری آیات کو ان کے لئے تحریک اسلام کا ذریعہ بتایا ہے)۔

۳۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ پر تاثیر قرآنی

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ آیتیں سنیں تو اسی وقت اسلام میرے دل میں گھر کر گیا، وہ آیات سورۂ نحل کی وہی مشہور آیات ہیں جو عام طور پر خطبۂ جمعہ میں پڑھی جاتی ہیں ترجمہ یہ ہے :-

"خدا عدل واحسان اور قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک
کا حکم فرماتا ہے اور بدکاری و برائی اور ظلم سے ممانعت فرماتا ہے
وہ اس لئے نصیحت کرتا ہے کہ شاید تم نصیحت مان لو"

یہ تین واقعات بطور نمونہ دورِ صحابہ سے متعلق پیش کر دیئے گئے بعد کے زمانوں میں بھی قرآن مجید سے "اثر پذیری" کے واقعات بکثرت موجود ہیں جنھیں بوجہ اختصار نظر انداز کیا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں اس قسم کے کتنے ہی واقعات خود علامہ نے بھی ضرور پڑھے ہوں گے اسکے باوجود انکا اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا موجب حیرت ہے کہ "قرآن فہمی" مقدمۂ تفہیم کے بغیر ممکن ہی نہیں، اسکا واحد نسخہ یہی مقدمہ ہے۔

ہم دور نکلے جا رہے ہیں

بات چل رہی تھی علامہ کے مقدمۂ تفہیم کی جس کے تین اقتباسات ناظرین کے ملاحظہ کیلئے لائے جا چکے ہیں اب مقدمۂ تفہیم کا چوتھا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

علامہ اپنے "منصوبۂ کار" کے مطابق اپنی تفہیم القرآن یا اصل قرآن ہی کیلئے مقدمۂ کتاب کی ضرورت و اہمیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"قرآن (مجید) کس قسم کی کتاب ہے؟ اسکے "نزول کی کیفیت" اسکے "ترتیب کی نوعیت" کیا ہے؟ اسکی ساری بحث "کس مدعا" کیلئے ہے؟ "کس مرکزی مضمون" کے ساتھ اسکے بے شمار مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرز استدلال اور کیا طرز بیان اس نے "اپنے مدعا" کیلئے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی چند ضروری سوالات ہیں جنکا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے آدمی کو اگر ابتدا ہی میں مل جائے تو بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اسکے لئے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ جو شخص قرآن (مجید) میں "تصنیفی ترتیب" تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پاکر کتاب

Scanned with CamScanner

کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے اسکی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان سارے مبادیات سے ناواقف ہے اور وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مذہب کے موضوع پر ایک کتاب پڑھنے چلا ہے (چند سطروں بعد) مگر جب وہاں اسے اپنے "ذہنی تصور" سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کر سکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث اسکے بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے"۔ (مقدمہ تفہیم ص۱۵و۱۶)

کمالِ صحافت کی داد دیجئے

راقم السطور کی بے کیف تحریر سے بے مزہ ہو جانے کے بعد ناظرین کرام نے علامہ کے اس طول طویل اقتباس سے یقیناً خاطر خواہ لطف اٹھایا ہوگا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علامہ نے اس موقع پر تو "مقدمہ تفہیم" کی ضرورت وافادیت ثابت کرنے میں بڑا زور قلم صرف فرمایا ہے۔ موصوف نے اس مقام پر بغیر مقدمہ تفہیم "قرآن فہمی" کے دشوار ہونے کی جو تصویر کشی فرمائی ہے سچ پوچھئے تو انھیں کا حق بھی ہے۔ ذرا غور فرمائیے تو اندازہ ہوگا کہ علامہ کا "کمالِ صحافت" اور "جادوئے تحریر" اس حد تک پہونچا ہوا ہے کہ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر کسی نے "مقدمہ تفہیم" سے استفادہ کئے بغیر ہی قرآن مجید کو کسی طرح کچھ تھوڑا بہت اگر سمجھا بھی ہوگا تو مقدمہ تفہیم پڑھنے کے بعد کہیں اس کی نیت نہ خراب ہو جائے اور وہ بھی از سر نو" قرآن فہمی" کی ضرورت نہ محسوس کرنے لگے

کیونکہ یہ تمام "شرائط و قیود" اور "بنیادی مقدمات" ابتک اسے معلوم ہی نہ تھے، اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ "قرآن فہمی" کیلئے "ناظر قرآن" کو مبادی سے واقف ہونا بھی ضروری ہے بغیر ان کے وہ بہت سے خطرات میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔

اب مقدمۂ تفہیم پڑھکر اسے یہ معلوم ہوگا کہ "قرآن فہمی" کے لئے اس "ہفتخواں" سے بھی گذرنا ضروری ہے تو اسے اپنی لاعلمی و بے خبری کا شدید احساس ہوگا جس کے نتیجہ میں اندیشہ یہ بھی ہے کہ اسکی آئی سمجھ بھی جاتی رہے اور ابتک قرآن مجید کو وہ جتنا کچھ سمجھ سکا تھا اس سے بھی اپنے آپ کو ناواقف و جاہل نہ سمجھنے لگے اور پھر فرط غم و شدت حسرت میں وہ کف افسوس ملے اور کہنے لگے کہ افسوس ہے میری حالت پر کس طرح میں اب تک ــــــ قرآن مجید کو ایک مکمل کتاب سمجھتا رہا اور اس حقیقت ہی سے بے خبر رہا کہ اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب میں "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کی اتنی بڑی خامی موجود ہے؛ جسے علامہ نے اپنے مقدمۂ تفہیم میں ظاہر فرمایا ہے۔ افسوس ہے میری حالت پر جو میں نے ابتک یہ نہ معلوم کیا کہ اسکا موضوع گفتگو کیا ہے؟ اسکا مدعا کیا ہے؟ یہ جانے بوجھے بغیر یوں ہی اسے سمجھنا شروع کر دیا اور اپنا مدعا اس سے حاصل کرنے لگا۔

کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو تفہیم القرآن کا مقدمہ لکھے جانے کے بعد ہی دنیا میں آئے کہ انھیں مطالعۂ قرآن سے پہلے ہی تفہیم کے ذریعہ یہ حقیقت تو معلوم ہوگئی کہ قرآن مجید تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کے معیار پر پورا نہیں اترتا؛ یہ تو علامہ ہی کی ہمت تھی جنھوں نے مختلف ترکیبوں اور متعدد پینتروں سے قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کو ہدف تنقید بنانے کیلئے ایسا شاندار مقدمہ لکھ دیا

یہ دوسری بات ہے کہ موصوف نے پہلے قرآن مجید کی تصنیفی ترتیب و کتابی اسلوب کو ہدفِ تنقید بنایا اور بعد میں اسکا مداوا بھی خود ہی پیش فرما کر اپنے کو معالج اور مصلحِ کلام اللہ کے روپ میں بھی پیش فرما دیا ہے جیسا کہ مصرع مشہور ہے ؏۔

تمھیں نے درد دیا ہے تمھیں دوا دینا

اعتراض میں جلدی نہ فرمائیے

راقم السطور کی سطور بالا پڑھکر شاید بعض حضرات حیران ہوں اور میری اس تحریر کو میری آشفتہ بیانی پر محمول فرماتے ہوئے کوئی اعتراض فرمانا چاہیں اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں پہلے ہی بات صاف کرتا چلوں کہ میرا یہ اندازِ تحریر جو ابھی سطور بالا میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے یہ میری "آشفتہ بیانی" اور "پریشان نگاری" کا نتیجہ ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ دراصل علامہ کے مندرجہ بالا فقروں کا "عکس مستوی" ہے (عکس مستوی یہاں جواب ترکی بہ ترکی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے منطقی اصطلاح مراد نہیں ہے)۔ علامہ نے مندرجہ اقتباس میں جو فقرے بطور تمثیل استعمال فرمائے ہیں میرا مقصد علامہ کی اُس تمثیل کو اپنی اِس تمثیل کے ذریعہ صرف ذہن نشین کرانا ہے اور بس کہ ہمارے ناظرین کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ کس طرح کوئی شخص "سر رشتۂ مضمون" ہاتھ نہ آنے پر بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک "اجنبی مسافر" ہو جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح یہ راقم السطور مقدمۂ تفہیم کا بین السطور پڑھنے میں سرگرداں ہو رہا ہے اور جس طرح شاید آپ میں سے بھی بعض حضرات میری تحریر کا سر رشتۂ مضمون تلاش

کرنے میں میرے تبصرے کے بین السطور کھٹکنے لگ رہے ہوں گے مگر خیر مجھ کو تو مقدمہ تفہیم کا سر رشتہ نگارش ہاتھ نہ لگ نہ سکا البتہ آپ حضرات کو انشاء اللہ میرا "مدعائے گذارش" ضرور معلوم ہو جائے گا۔

گل دیگر شگفت — کتابی سانچہ

ہمارے علامہ نے مقدمۂ تفہیم لکھنے کے لئے جب قلم اٹھایا تھا تو یہ بات دل میں ٹھان لی تھی کہ جس طرح بھی بنے گا وہ اپنے ناظرین کو اپنے اس مقدمہ کی ضرورت تسلیم کرا کے ہی دم لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اصل مقدمہ کے مباحث ثلٰثہ (مبادی ثلٰثہ) یعنی موضوع۔ مرکزی مضمون اور مدعا کی تعیین و توضیح (منجملہ ۲۸ صفحات) صرف ڈیڑھ دو صفحوں ہی میں فرمائی ہے (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹ و ۲۰) بقیہ تقریباً ۲۶ صفحات میں انکی ہر بات کی تان مقدمہ نگاری کی ضرورت ہی ثابت کرنے پر ٹوٹتی ہے اور ان میں بھی شروع کے چار پانچ صفحات (ص۱۲ لغایت ص۱۶) تو صرف اسی مقصد کے لئے مخصوص ہیں ان میں بس یہی ثابت کیا گیا ہے کہ یہ قرآن مجید معاذ اللہ تعالیٰ منہ علامہ کی مزعومہ تصنیفی ترتیب اور کتابی اسلوب کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہے یہ تو ایک غیر مرتب و غیر مربوط اور منتشر شذرات کا مجموعہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن فہمی کی راہیں لوگوں پر بند ہیں اور علامہ نے انھیں راہوں کو کھولنے کیلئے مقدمہ نگاری اور تفسیر نویسی کی یہ زحمت گوارا فرمائی ہے۔

مقدمہ تفہیم کی اسی ضرورت کو مزید ثابت کرنے کے لئے علامہ اپنی ایک ہی بات کو معمولی لفظی "ہیر پھیر" کے ساتھ دُہرائے چلے جا رہے ہیں "تصنیفی ترتیب

اور"کتابی اسلوب" کی تعبیریں تو بار بار پڑھ ہی چکے اور "انشر الفنی" سے علامہ کی واقفیت کا اندازہ لگا ہی چکے اب ایک نئی تعبیر "کتابی سانچہ" بھی ملاحظہ ہو۔

"اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔ اسکی تصنیف دنیا کی ساری کتابوں سے مختلف طور پر ہوئی ہے۔ اپنے "موضوع" اور "مضمون" اور "ترتیب" کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے۔ لہذا تمھارے ذہن کا "کتابی سانچہ" جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کریگا بلکہ الٹا مزاحم ہوگا اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اسکی عجیب خصوصیات سے شناسائی حاصل کرو" (مقدمہ تفہیم ص ۱۶)

پہیلی کا جواب آگے آ رہا ہے ۔

"تصنیفی ترتیب" "کتابی اسلوب" اور "کتابی سانچہ" یہ سارے ہی الفاظ ایک سے ایک چیستاں اور پہیلی بنکر بار بار آ رہے ہیں مگر یہ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہ آخر علامہ کی ان سے مراد کیا ہے؟ تو اس پہیلی کا جواب آگے آ رہا ہے یہاں پہلے تو میں اپنی پچھلی بات کا اعادہ کرتا چلوں کہ علامہ کو "قرآن فہمی کی "شاہ کلید" (Master Key) سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ چنانچہ موصوف قرآن فہمی کی رکاوٹ کبھی تو اسکے "غیر مرتب" اور غیر مربوط ہونے کو قرار دیتے ہیں اور کبھی اسکی

"تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کو "نا فہمی" کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور کبھی فرط حیرانی میں ناظر کے "کتابی سانچہ" کا اختلاف انھیں قرآن فہمی کی راہ میں رکاوٹ بنا نظر آتا ہے۔ حالانکہ ہم سے پہلے دوسری آسمانی کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ایک تقابلی نقشہ بھی پیش کرکے یہ دکھلا چکے ہیں کہ قرآن مجید اپنی تصنیفی ترتیب یا کتابی اسلوب کے اعتبار سے کسی طرح بھی قابل اعتراض یا ایسا غریب و غیر مانوس بھی ہرگز نہیں ہے کہ اسکی روح تک رسائی علامہ کے مقدمۂ تفہیم کے بغیر ہو ہی نہ سکتی ہو جیسا کہ علامہ اپنے مقدمہ اور دیباچہ میں ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

بنیادی غلطی کا سراغ مل ہی گیا

علامہ کے مندرجہ بالا شہ پارۂ تحریر میں یہ عجیب و غریب بات بھی علامہ کے قلم سے بیساختہ نکل ہی گئی کہ "تمھارے ذہن کا وہ "کتابی سانچہ" جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب (قرآن مجید) کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کرے گا بلکہ الٹا مزاحم ہوگا"

کس قدر پر لطف بات ہے یہ جو علامہ اپنے ناظرین تفہیم ہی کو مخاطب فرما کر ارشاد فرما رہے ہیں جنکا مطالعہ یقیناً علامہ کے مطالعہ سے بہت ہی کم ہوگا، تو سوال یہ ہوتا ہے کہ جب عام ناظرین کا مطالعہ علامہ کی نظر میں "قرآن فہمی" کی راہ میں معاون ہونے کے بجائے الٹا مزاحم ہو سکتا ہے تو ذرا غور فرمائیے کہ خود آں علامہ کیلئے ان کا زبردست مطالعہ کس قدر مزاحم ہو رہا ہوگا؟

جب ایک عام ناظر علامہ اینڈ کمپنی کی چند کتابیں پڑھ لے تو اس کے

نتیجہ میں اسکے ذہن کا "کتابی سانچہ" قرآن فہمی کی یکسر صلاحیت ہی کھو بیٹھے تو اندازہ کیجئے علامہ کے اس کتابی "چوکھٹے" کا جو اتنی بڑی تعداد میں کتابوں کے مطالعہ سے تیار ہوا ہوگا۔ آخر وہ کتابی چوکھٹا ؍ قرآن فہمی کی راہ میں کیسا کچھ مزاحم اور حائل ہو رہا ہوگا؟ مگر علامہ کو اپنی ہی اس منطق کے خلاف یہ زعم بھی ہے کہ قرآن فہمی کا جو حق وہ ادا کر رہے ہیں ؎

حق تو یہ ہے کہ صرف ان کے سوا دوسروں سے یہ حق ادا نہ ہوا

کوئی صاحب بھی برا نہ مانیں

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے کسی کی تجہیل و تحمیق ہرگز مقصود نہیں ہے بلکہ یہ علامہ کی مندرجہ بالا تحریر بلکہ "نگارش جمیل" کا ایک حسین و دلچسپ نتیجہ ہے جسے راقم السطور نے جامۂ الفاظ پہنا کر ناظرین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس وضاحت و صفائی کے باوجود اگر کسی صاحب کو راقم السطور کی ان گذارشات میں کچھ تیزی یا نشتریت محسوس ہوتی ہے تو وہ براہ کرم دیباچہ تفہیم صث لغایت ص۱۱ کی وہ جراحت کاریاں دوبارہ ملاحظہ فرمالیں جن میں علامہ نے انتہائی معصومیت و سادگی کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے لیکر حافظ فتح محمد خاں صاحب تک کے تمام تراجم میں طرح طرح کے کیڑے نکالے ہیں۔ مختصر طور سے چند فقرے ملاحظہ فرمائے جائیں :-

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

علامہ دیگر تراجم کا ذکر فرما کر ان میں خامی اور کسر کی نشاندھی فرماتے ہوئے

Scanned with CamScanner

اسپنے دیباچہ تفہیم میں یوں ارشاد فرماتے ہیں ا۔

(الف) اس (ترجمے کے) طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جنکی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکتا" (صٹ سطر ۵ و ۶)

(ب) "پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ "روانی عبارت" "زور بیان" "بلاغت زبان" اور "تاثیر کلام" کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی "بے جان عبارت" ملتی ہے جسے پڑھکر نہ اسکی روح وجد میں آتی ہے نہ اسکے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں نہ اسکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں نہ اسکے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اسطرح کا کوئی تاثر رونما ہونا تو درکنار ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے جسکی نظیر لانے کیلئے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟

اسکی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزاء ہی کو اپنے اندر سے گذرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے اسکا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے"

(صٹ سطر ۷ تا ۱۵)

(ج) "اسکا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے اس طرح وہ ترجمہ قرآن کو نہ مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کر سکتا ہے کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اسکے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے" (صث سطر ۴ تا ۷)

(د) ایک اور وجہ اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر موثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں منتقل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اسکا ترجمہ کر ڈالا جائے (علامہ کے نزدیک دوسرے مترجمین اس غلطی و غفلت کا شکار ہو گئے ہونگے) تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے" (صث سطر ۱۲ تا ۱۴)

(ھ) اپنے اس پس منظر اور اپنی شان نزول کے ساتھ قرآن کی ان صورتوں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھدیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا اور قرآن کا پورا مدعا تو شاید کہیں اسکی گرفت میں آئیگا ہی نہیں" (ص۹ سطر ۱۲ تا ۱۴)

(و) پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن مجید، اگرچہ "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے لیکن اسکے ساتھ وہ اپنی مخصوص اصطلاحی زبان رکھتا ہے (جسکی حقیقت صرف علامہ پر ہی منکشف ہوئی ہے۔ حضرت

Scanned with CamScanner

شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے لیکر حافظ فتح محمد خاں صاحب تک سب ہی (اس نکتۂ نادرہ سے ناواقف رہے ہونگے) اس نے بکثرت الفاظ کو اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے (جب ان الفاظ کے وہ معانی لغت سے ثابت بھی نہیں ہیں اور علمائے تفسیر کو بھی وہ معانی معلوم نہیں ہوسکے تو حضرت علامہ پر کس نے انقا رکئے ہیں) اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جنکو مختلف مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیٔ لفظ کے ساتھ جو ترجمے کئے جاتے ہیں ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے۔ اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی الجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے (صنا سطر ۵ تا ۹)۔

ہر صاحب ایمان وانصاف فیصلہ کرسکتا ہے

دیباچۂ تفہیم کے یہ اقتباسات حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے تراجم سے لیکر حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ اور مولانا فتح محمد خاں صاحب تک بلکہ تفہیم القرآن کی تصنیف تک کے تمام مترجمین کی مساعیٔ جمیلہ کو کس طرح لغو بیکار غیر مفید بلکہ مضرت رساں ثابت کر رہے ہیں!

لہٰذا تکلف برطرف اگر حضرت علامہ کو یہ حق پہونچتا ہے کہ وہ زودِ صحافت میں اپنے قلم کی جراحت کاریوں کا نشانہ ان حضرات اکابر کو بنائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ موصوف کو ماورائے تنقید قرار دیکر انکے مزخرفات سے یکسر صرفِ نظر کرلیا جائے اور

انکے طلسم تحریر کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کو بے نقاب نہ کر دیا جائے ۔

بات کچھ دور جا پہونچی

بات چل رہی تھی غلطی کے بنیادی سراغ کی کہ علامہ نے بیاختہ غالباً بے شعوری میں یہ تحریر فرما دیا تھا کہ " ذہن کا کتابی سانچہ " جو ابتک کی کتب بینی سے بنا ہے اس کتاب کے سمجھنے میں تمھاری مدد نہ کریگا بلکہ الٹا مزاحم ہوگا " ۔ علامہ کے اس ارشاد پر مفصل تبصرہ کرتے کرتے ہم ذرا دور تک چلے گئے تھے ۔

اب ہمیں کہنا یہ ہے کہ جب لوگوں کے ذہنوں کا کتابی سانچہ قرآن فہمی میں میں مزاحم ہوتا ہے تو "سلامتی" اسی پرانے دستور تعلیم میں نظر آتی ہے اور قرآن فہمی کی راہ کھلنے کا طریقہ صرف ایک ہی نظر آتا ہے وہ یہ کہ جسے بھی " قرآن فہمی " منظور ہو وہ اپنی تعلیم کی ابتدا ہی قرآن مجید سے کرے ۔ جب دوسری کتابوں کے مطالعہ سے تیار ہونے والا " کتابی سانچہ " یا چوکھٹا ذہن میں موجود ہی نہ ہوگا تو قرآن مجید میں " کتابی اسلوب " اور " تصنیفی ترتیب " کی کمی اور خامی بھی نظر نہ آئیگی (علامہ تو شاید تصوف اور صوفیار کے قائل ہی نہیں ہیں ، صوفیار نے شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے فرمایا ہے " العلم الحجاب الاکبر ") ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے میں سب سے پہلے قرآن مجید ہی کی تعلیم دی جاتی تھی بلکہ اگلے وقتوں کے لوگ تو صرف قرآن مجید ہی کو کتاب ماننے اور کہنے کیلئے تیار تھے اور اسے بڑی کتاب ہی کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ ان بیچاروں کو اسکی کیا خبر رہی ہوگی کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جب کسی علامہ کے

زعم میں دوسری کتابیں تو کتاب ہونگی اور اللہ تعالیٰ کی اس بڑی کتاب کو کتاب
ثابت کرنے کیلئے کسی علامہ کو ایڑی سے چوٹی تک زور بھی لگانا پڑے گا۔
اور خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے ہم مسلمانوں کا کون سا امتحان
لینا ہے مقصود ہے کہ اس نے اپنی ایسی کتاب کو جو ڈاکٹریٹ کے لئے لکھے گئے
کسی مقالہ کی حسن ترتیب تصنیفی اور کتابی اسلوب بھی نہیں رکھتی (معاذ اللہ منہ)
جگہ جگہ اسے قرآن مجید میں "کتاب اللہ" اور "ذالک الکتاب" وغیرہ سے اسکا
ذکر فرما دیا ہے اور انسان کے ذہن میں تیار ہونے والے "کتابی سانچوں" کا مطلق
لحاظ نہ فرمایا۔

سمجھ میں نہیں آتا

قرآن مجید کو جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے دوسری انسانی تصنیفات
کے معیار پر پرکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اسطرح اسکی "تصنیفی ترتیب" اور
"کتابی اسلوب" کو ہدفِ اعتراض و تنقید بنا دیا جائے۔ نظم قرآنی کے اس اعجاز کو
جسے مجروح کرنے کی ہمت مخالفین اسلام بھی نہ کر سکے محض "اپنا علمی رعب" اور
"تحقیقی تفوق" ثابت کرنے کیلئے مقدمہ تفہیم میں علامہ نے اس سے متعلق
"شک وارتیاب" کی جو "فضا سازی" فرمائی ہے اس پر تبصرہ کرنے کے لئے
مناسب اور موزوں الفاظ آسانی سے میسر نہیں آرہے ہیں۔
بہر حال قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" و "کتابی اسلوب" سے متعلق کسر
اور خامی کے یہ پہلو جو شاید ہی کسی کے حاشیۂ خیال میں آئے ہوں انھیں اس شدت

کے ساتھ محسوس کرا کے اور با قاعدہ تکرار اسلوب و عبارت کے ذریعہ اچھی طرح ذہن نشین بھی فرما کر علامہ موصوف نے قرآن فہمی کی کونسی راہ نکالی ہے یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ہمیں تو پوری تفہیم میں یہی نظر آتا ہے

علامہ نے ہر موقع پر صرف یہی کوشش کی ہے کہ انکا پڑھنے والا صرف انھیں کو مانے انھیں کو جانے وہ قرآن مجید بھی پڑھے تو صرف اسی "عینک" سے پڑھے جو انھوں نے اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" کے بین السطور ہر ناظر کیلئے مہیا فرما دی ہے اور ہمارا یہ تاثر ظن و تخمین پر ہرگز مبنی نہیں ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ہم علامہ کے اس منصوبہ بندی کی مثالیں آئندہ پیش کر کے اپنا دعوی مدلل و مستحکم کرتے رہیں گے۔

آپ ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ

آپ بھی کسی "اجنبی مسافر" کی طرح تنقید و تبصرہ کے اس نئے شہر کی گلیوں میں یونہی گھومتے پھرتے اور بھٹکتے رہیں گے اور سررشتۂ مضمون آپکے آپ کے ہاتھ نہ لگ سکے گا' نہیں نہیں انشاء اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔

"مقدمۂ تفہیم کا فیصلہ سنا دینے کے بعد عنقریب ہی علامہ کی اصل تفسیر پر بھی راقم السطور کو اپنی معروضات پیش کرنی ہیں اسوقت انشاء اللہ تعالیٰ تفصیل سے علامہ کی قرآن فہمی کے شاہکار اور خدمت قرآن و سنت کے نمونے

آپ کے سامنے آسکیں گے۔

ناظرین کرام کو یاد ہوگا

ہم نے اثنائے تبصرہ پہلے کہیں یہ بات اشارۃً کہی تھی کہ علامہ نے اپنی یہ تفسیر تفہیم القرآن واقعتاً قرآن فہمی کیلئے لکھی ہی نہیں ہے بلکہ اسکی آڑ میں دراصل وہ اپنی تحریک کی تفہیم اور "ذہن سازی" فرما ڈالنا چاہتے ہیں اسی لئے وہ جہاں کہیں موقع پاتے ہیں اپنے تفسیری دیباچہ و مقدمہ اور اصل تفسیر میں بھی نہایت صفائی و چابکدستی کے ساتھ آہستہ سے بالکل غیر محسوس طور پر کوئی ایسا لفظ بھی اپنی تحریر میں شامل کر دیتے ہیں جسے انکی تحریک و جماعت سے غیر متعلق لوگ تو زیادہ محسوس بھی نہ کر سکیں مگر انکی "امت مسلمہ" اسکا بین السطوری مطلب اچھی طرح سمجھ لے اور پھر اپنے درس قرآن کے پروگرام میں انھیں خطوط پر مطالعہ قرآن کے ذریعہ روح قرآنی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

علامہ نے اسی منصوبہ ذہن سازی کے تحت "تفہیم القرآن" کی تصنیف سے بہت پہلے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" نامی رسالہ تصنیف فرمایا جسمیں موصوف نے قرآن کی ان چار بنیادی اصطلاحوں پر ایک خاص انداز میں اور ایک نئے پہلو سے کلام فرمایا جس پر دین اسلام کا محور گردش کرتا ہے اور اپنی انہی تشریحات کو مرکزی خیال دیکر تفسیر قرآنی کیلئے ایک نیا نمونہ پیش کر دیا۔

موصوف کی اس نئی اپج ہی نے انکے قلم سے وہ سطور نکلوا دیں جو دبہ نقل ہوئیں کہ:۔

(الف) ۔ "قرآن وسنتِ رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر وحدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں"۔ (تنقیحات ص ۱۲۶)

(ب) ۔ "بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (الٰہ رب ۔ دین اور عبادت) کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کیلئے خاص ہو گیا"

(قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

استاد حسن اسمٰعیل مصری مولانا ندوی کے ہمنوا ہیں

حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی دامت برکاتہم اپنی تازہ تصنیف "عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" میں اخوان المسلمین کے مرشد عام فاضل استاد حسن اسمٰعیل الہیضبی کی کتاب "دعاۃ لاقضاۃ" سے نقل فرماتے ہیں

"(علامہ مودودی کا)" یہ دعویٰ واقعہ اور تاریخی حقیقت کے مطابق نہیں ہے اسلئے کہ ان کلمات کے جاہلیت میں جو کلی معانی ومفہومات رائج رہے ہوں، قرآن کریم انکے اس خاص معنی کو متعین کرتا ہے جو ان کلمات سے اسکا مقصود ہے اور ان لفظوں میں سے ہر لفظ سے اسکی جو مراد ہے اسکا پورا تعارف کراتا ہے اور اسکو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس مفہوم کے چہرے

Scanned with CamScanner

سے اسطرح نقاب اٹھاتا ہے کہ اشتباہ یا ابہام کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی اس وضاحت نے ان کلمات کے اصل لغوی مفہوم کی طرف رجوع کرنے اور اس کے نزول سے پہلے انکے جو معانی تھے انکے سراغ لگانے کی ضرورت باقی نہیں رکھی کوئی مسلمان اس بارے میں ذرا بھی شک میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ قرآن کا طریقہ اور اسکی شرح و وضاحت سب سے زیادہ محکم و واضح، حاوی اور بلند پایہ ہے، بلکہ اسکا اختیار کرنا اس پر کلی اعتماد کرنا اور اسکے نتیجے اور مطالبہ کو تسلیم کرنا ضروری ہے خواہ ان مفاہیم کے مطابق ہوں جو نزول قرآن سے پہلے عرب میں پائے جاتے تھے یا ان کے خلاف" (دعاۃ لا قضاۃ ص ۱۹، ۲۰ بحوالہ دین کی تفہیم و تشریح ص ۳۲)۔

فاضل موصوف مزید فرماتے ہیں :۔

"کیا یہ حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے درست ہوگا کہ جب عرب مختلف و متفرق قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور انمیں سے ہر ایک کی ذیلی زبان (بولی اور انداز گفتگو کے لحاظ سے) الگ الگ تھی وہ کسی ایک حکومت و ثقافت و تہذیب اور یکساں عقائد کے جھنڈے کے نیچے نہیں تھے وہ ایک ناخواندہ قوم تھے جن میں ایسے افراد شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے جو پڑھنے لکھنے کے فن سے کسی قسم کی راہ و رسم رکھتے ہوں۔ ان سب پر جہالت

جہالت و انحطاط کا تاریک سایہ تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی آسمانی کتاب نہ تھی نہ کسی علم و فن پر انکو دسترس تھی۔ جب وہ اس پست حال میں تھے تو "الٰہ، رب، عبادت، دین" کے صحیح مفاہیم ان کے یہاں شایع و ذائع تھے انکا ہر فرد ان سے یکساں طور پہ آشنا اور انکی معین اور غیر مشتبہ اور غیر مشترک حقیقت سے آگاہ تھا لیکن جب اللہ کی کتاب اس ذکر کے ساتھ نازل کی گئی جسکی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے ـــــ جس کے بیان میں کسی قسم کا ابہام اور جس کی وضاحت میں کسی قسم کا نقص نہیں ـــــ تو وہ معانی پردۂ خفا میں چلے گئے؟ اور امت انکی دولت سے محروم ہوگئی وہ لوگوں میں اسطرح مشہور و رائج نہیں رہے جیسا کہ وہ زمانۂ جاہلیت میں معروف و مشہور تھے؟

کیا اتنا بڑا دعویٰ اس حالت میں زیب دیتا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں کے درمیان موجود و محفوظ ہے۔ اور ان میں سے کوئی شخص بھی سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص یا معوذتین پڑھ یا سن لے وہ ان حقیقتوں کو سمجھ لے گا اور ان معانی تک پہونچ جائیگا جنکی زمانہ جاہلیت کے آدمی کو ہوا بھی نہیں لگی تھی"

(دعاۃ لا قضاۃ ص۲۰ تا ص۲۵ بحوالہ بالا)

"مصنف (مودودی صاحب) کا یہ دعویٰ کہ ـــــ "اسلام سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الٰہ، رب اور

دین و عبادت کے وہ معنی باقی نہیں رہے جو نزول قرآن کے وقت
غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے"

بالکل ایک بے دلیل دعویٰ اور بے سند الزام
ھے جس پر کسی عمارت کی بنیاد قائم نہیں کیجا سکتی۔ ہم نے
ہم نے قرآن مجید کی جن آیات کو بطور نمونہ پیش کیا ہے ان سے
"الوہیت" اور "ربوبیت" کے معنی متعین ہو جاتے ہیں مفسرین نے
کسی دور میں بھی (علی سبیل المثال) رب کے معنی میں سے کسی ایک
معنی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے ہر موقع پر اس کلمہ کی وہی تشریح
کی ہے جو سیاق و سباق کے مطابق تھی" (حوالہ بالا)

مشتے نمونہ از خروارے

شاید ناظرین کرام راقم السطور کے اس دعوے کو بدگمانی پر محمول کریں
کہ "تفہیم القرآن" قرآن فہمی کیلئے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس سے مقصود تحریک مودودیت
کی تفہیم اور اسکے لئے ناظرین کی ذہن سازی منظور ہے۔ اس لئے اس موقع پر تفہیم
کے مقدمہ سے چند مثالیں بھی پیش کیجا رہی جن پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح اور
نمایاں ہو جائیگی کہ کس طرح علامہ نے درپردہ اپنے مدعائے دلی کو اپنے الفاظ کی
جادو نگاری کے ذریعہ ناظرین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:-

(الف) "اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کیلئے وہی "رویہ" درست
اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم "صحیح رویہ" کے نام

سے بیان کر چکے ہیں" (مقدمہ تفہیم ص۱۹)

(ب) "اس (قرآن) کا مدعا انسان کو صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا"
(مقدمہ تفہیم ص۲۰)

(ج) "چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کرکے "امت مسلمہ" بننے کیلئے تیار ہو گئے" (ص۲۱)

(د) "اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ "تحریک" پھیلتی چلی گئی" (ص۲۲)

(ہ) "لوگ پرانی جاہلیت سے ٹوٹ کر اس "نوخیز تحریک" کیطرف آرہے تھے" (ص۲۲)

(و) خود "امت مسلمہ" کے نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے" (ص۲۴)

(ز) "ان ہدایات (قرآنی) میں بتایا گیا کہ "جماعت" اور "ریاست" اور مدنیت صالحہ کی تعمیر کس طرح کیجائے" (ص۲۴)

(ح) "غرض اسے (داعی الی اللہ کو) "وہ سب کچھ کرنا" ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک تحریک کے لیڈر کیلئے ضروری ہے" (ص۲۵)

(ط) "یہی وجہ ہے کہ "دعوت اسلامی" کے ایک مرحلہ میں قرآن کی جتنی سورتیں نازل ہوئی ہیں" (مقدمہ ص۲۶)

(ی) "خلافت الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس "عظیم الشان تحریک" کی رہنمائی کرتی رہی" (مقدمہ ص۳۳)

(ل) "ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست کی بنیاد پڑ گئی" (دیباچہ سورۂ بقر ص۴۷)

(م) "مدینہ پہونچکر اس قسم کے منافقین کے علاوہ چند اور قسموں کے منافق بھی "اسلامی جماعت" میں پائے جانے لگے" دیباچہ سورۂ بقرہ صفحہ ۴۸)

(ن) "دوسرے قسم کے منافق وہ تھے جو "اسلامی جماعت" کے دائرۂ اقتدار میں گھر جانے کیوجہ سے اپنا مفاد اسی میں دیکھتے تھے" (دیباچہ سورۂ بقرہ صفحہ ۴۸)

علامہ کی تجدد پسندی

مندرجہ ذیل فہرست الفاظ میں سے آخری تین مثالیں چھوڑ کر (جو سورۂ بقر کے دیباچہ سے ماخوذ ہیں) بقیہ گیارہ مثالیں مقدمہ کے آخری دس صفحات سے ماخوذ ہیں ان مثالوں سے یہ حقیقت اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علامہ نے اپنی تفہیم میں کس ہوشیاری اور صفائی سے "اپنی تحریک مودودیت" کی روح سمو دی ہے کہ کسی بھی ناقد کیلئے اس پردۂ نظر فریب کو چاک کرنا مشکل ہو جائے۔

اقتباسات مندرجہ بالا کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہ پوشیدہ حقائق سامنے آتے ہیں :-

(شق الف و با میں) "رویہ" اور "صحیح رویہ" کے الفاظ جو یقیناً "دین اسلام" کی جگہ استعمال کئے گئے ہیں کس قدر بے روح اور غیر مقدس ہیں دین و مذہب کے متوارث اور اصطلاحی الفاظ کی جگہ "رویہ" کا لفظ بڑا نامانوس، بے روح اور بے جان نظر آرہا ہے لیکن علامہ اپنی تجدد پسندی سے مجبور ہیں انھیں "دین و مذہب" اور "اسلام" جیسے الفاظ کی بجائے "رویہ" فرمانا ہی پسند آیا اور اپنے اسی رویہ پہ اصرار بھی ہے۔

(شق ج میں) " چند صالح آدمی " " امت مسلمہ بننے کیلئے تیار ہو گئے " پڑھکر کون ہے جسکا ذہن علامہ کی تحریک کے ابتدائی دور کی طرف منتقل نہ ہوگا۔ جب اسی طرح "چند صالحین" علامہ کے خود ساختہ دارالاسلام (پٹھان کوٹ) میں موصوف کی تحریک سے متاثر ہو کر " امت مسلمہ " بننے کیلئے تیار ہو گئے تھے۔ اور یہ علامہ کی چابکدستی و ہوشیاری ہے کہ انھوں نے اصل دعوت اسلام اور اپنی " تحریک " کے مابین یکسانیت و مماثلت کا تصور پیدا کرنے کیلئے چند " صالحین " کی معاً اثر پذیری ذکر فرمائی ورنہ ظاہر ہے کہ اصل دعوت اسلام کے موقع پر چند صالحین اس طرح ایک ساتھ مجتمع نہ ہو سکے تھے جسطرح "پٹھان کوٹ" کے دارالاسلام میں ہو گئے تھے۔

(شق دال و یا میں) " دعوت اسلام " اور " تبلیغ اسلام " کے مبارک و متوارث الفاظ کو چھوڑ کر صرف اپنے تفرد و شذوذ کی غمازی و نشاندھی کیلئے " تحریک " کا غیر مقدس لفظ استعمال کرنا پسند کیا جو دینی روح اور شائبہ تقدس سے یکسر خالی ہے۔ پھر ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ اتنی موٹی حقیقت سے بھی بے خبر ہو سکتے ہیں کہ تحریک کا مبنیٰ انسانی افکار و نظریات ہوتے ہیں اور اسکا سر رشتہ کسی انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جبکہ مذہب خداوندی اور دین اسلام کا مبنیٰ وحی خداوندی سے ثابت شدہ ناقابل انکار حقائق ہیں جنکا سر رشتہ انسان کے ہاتھوں کی بجائے " حبل اللہ المتین " سے وابستہ اور پیوستہ ہے تحریکیں انسان کے ہاتھوں وجود میں آتی ہیں اور اپنی موت مر جاتی ہیں اور دین اسلام منزل من اللہ اور تاقیام قیامت باقی رہنے والا ہے۔

(شق واو و زاء میں) ملاحظہ فرمایئے اور لطف لیجئے کہ علامہ نے کس طرح

"امت مسلمہ" "جماعت" "ریاست" اور "مذہب" اور مدنیت صالحہ وغیرہ کے الفاظ استعمال فرماکر ناظرین تفہیم کے سامنے اپنے دارالاسلام مرحوم کی تصویر کشی فرماکر پرانی یاد تازہ فرمادی ہے جو کسی زمانہ میں پٹھان کوٹ میں منخشب کی طرح رونما ہوا تھا (شق ح میں) علامہ نے کس طرح حضرات انبیاء و رسل اور داعیان الی اللہ کو کسی بھی دعوت کے علمبردار اور کسی بھی تحریک کے لیڈر کے شانہ بشانہ لا کھڑا کردیا۔

غور کیجئے، تو حضرات انبیاء کرام کی شان اقدس میں بے ادبی اور جسارت ہونے کیلئے اتنی ہی بات بہت تھی لیکن علامہ صرف اتنی ہی بات پر اکتفا نہیں فرماتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ

"اسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علمبردار اور ایک لیڈر کیلئے ضروری ہے"

خطرہ کی گھنٹی

علامہ کے یہ الفاظ کسی داعی الی اللہ کو کسی لیڈر کیطرح اپنی تحریک کو چلانے اور کامیاب بنانے کیلئے کس حد تک پہنچنے کی نشاندھی کرسکتے ہیں" لیڈروں" کی تاریخ سے واقف حضرات ہی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ ان الفاظ کے بین السطور علامہ نے اپنے دلی منصوبوں کی طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے کہ خود آں موصوف اپنی تحریک کو پروان چڑھانے اور کامیاب بنانے کیلئے وہ سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہیں جو کسی بھی لیڈر نے اپنے کو کسی منصوبہ اور "ازم" کو چلانے اور پھیلانے کیلئے کیا ہے۔ (شق طاء و یاء میں) دعوت کے ساتھ ساتھ تحریک کا لفظ بھی چل رہا ہے

تاکہ پرانے الفاظ سے مانوس اذہان کہیں صرف لفظ "تحریک" کے استعمال سے کھٹک نہ جائیں اسلیے دونوں ہی لفظ ساتھ ساتھ چلتے رہیں بقول اکبر مرحوم

پیتا ہوں شراب ہوں آب زمزم کے ساتھ

رکھتا اک اونٹنی بھی ہوں ٹم ٹم کے ساتھ

(شق کاف ولام میں) "خلافت الہٰیہ" اور "چھوٹی سی" اسلامی ریاست" کے الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ ناظرین تفہیم پر صرف یہ حقیقت منکشف ہو کہ ابتدائے دعوت اسلام میں نہ تو اذانیں دی گئیں نہ نمازیں پڑھی گئیں نہ ہی اور کسی قسم کی عبادات کی فکر کیگئی بلکہ خدانخواستہ ونعوذ باللہ منہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بالکل ہمارے علامہ مودودی کی طرح "حکومت الہٰیہ" کا ایک نعرہ لگایا تھا اور نعرہ لگانے کے بعد چند صالحین کے تعاون سے دارالاسلام قائم کر دیا تھا اور آپ کا سارا کارنامہ بس یہی تھا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(شق میم ونون میں) "حضرات صحابہ" یا "ابتدائی مسلمانوں" کے الفاظ و تعبیر کی بجائے "اسلامی جماعت" کا فقرہ سپرد قلم فرما کر کس لطیف انداز میں علامہ نے اپنی "جماعت اسلامی" کا "شجرۂ نسب" دور نبوت اور عصر صحابہ میں بھی نکال دکھایا اور مزید لطف یہ کہ شاید بالکل غیر شعوری طور پر صرف اتنا فرق باقی رہنے دیا کہ دور صحابہ میں تو "اسلامی جماعت" کا فقرہ تحریر فرمایا گیا ہے جبکہ علامہ نے اپنی موجودہ جماعت کے لئے "جماعت اسلامی" کا نام تجویز فرمایا ہے۔ دونوں تعبیروں کا یہ فرق ظاہر کر رہا ہے کہ اس وقت دور نبوت میں جو جماعت تھی یعنی حضرات صحابۂ کرامؓ انکے نزدیک اسلام کا تصور مقدم اور جماعت کا تصور موخر تھا جسے علامہ نے اپنے دور تجدد میں "ترقیٔ معکوس" سے

ذریعہ "جماعت اسلامی" کی ترکیب دیکھ یہ تاثر بھی دیدیا کہ اب اسوقت کی جماعت میں تصور جماعت مقدم اور تصور اسلام موخر ہے۔ داد دیجئے علامہ کی اس شان تجدد کو۔ اور اب تو یہ لطیفہ حقیقت بھی ہو چکا ہے

یہ صرف ظن و تخمین نہیں ہے بلکہ مبنی بر حقیقت حقیقی تنقید ہے

علامہ مودودی کے مصاحب خاص جناب کوثر نیازی نے اپنے ایک تفصیلی مکتوب میں ان حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ مکتوب یکم مارچ ۱۹۶۵ء کو قومی آواز لکھنؤ سے شایع ہو چکا ہے چند ضروری فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

(الف) "میں بہت گنہگار ہوں، میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کیوجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اسکی نمائندگی کروں۔ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے۔ ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کیوجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے"

(ب) "ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا اسکے لئے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دیکر اس پر

Scanned with CamScanner

تنقید کرنے بھی دریغ نہیں کیا۔

(ج) "پہلے ہم علمار کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کے ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے اب علمار کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں"

(د) رائج الوقت سیاسی بحثیں اتنی مرغوب ہو چکی ہیں کہ ہماری مجالس میں خدا و رسولؐ کا تذکرہ بھی برائے بیت رہ گیا ہے۔ عبادت میں ہم سخت تساہلی کا شکار ہیں، اور شاید یہ بھی ہمارے لٹریچر کا غیر شعوری اثر ہے جس میں عبادات کو مقصود کیلئے ذریعہ اور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔"

(جماعت اسلامی کا شیش محل ص۹۵ تا ۹۴)

راز سے پردہ اٹھتا ہے

مقدمہ تفہیم پر تبصرہ کے دوران قرآن مجید کے اسلوب کی تعیین و وضاحت کے سلسلے میں یہ بات تو آپ بار بار پڑھ چکے کہ علامہ مودودی کے خیال میں قرآن مجید "تصنیفی ترتیب" اور کتابی اسلوب سے خالی ہے مگر ابتک پتہ نہ چل سکا کہ آخر علامہ کے نزدیک "کتابی اسلوب" کا مطلب کیا ہے؟ تو لیجئے علامہ اپنے مقدمہ تفہیم میں قرآن مجید کی "کیفیت نزول" کی بحث کا آغاز فرماتے ہوئے اس راز سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

(۴) "اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لیکر اپنی انتہائی

تکمیل تک تیئیس سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی انکی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہوسکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کیلئے کسی مقالہ میں اختیار کیجاتی ہے" (مقدمہ تفہیم ص۲۵)

بازی بازی باریش بابا ہم بازی

مقدمہ تفہیم کی مندرجہ بالا عبارت کو پورے غور وفکر کے ساتھ پڑھیئے اور علامہ کی جودت وجدت کی داد دیجئے کہ موصوف کو اکابر واسلاف پر بیدھڑک تنقید کرنے کی ایسی لت پڑگئی ہے کہ وہ اپنی تنقید سے نعوذ باللہ منہ خدا تعالیٰ کو بھی بخشنے کیلئے تیار نہیں۔

خدارا انصاف فرمائیے کہ عبارت بالا کا ماحصل اور تاثر یہی تو ہے کہ" لوح محفوظ میں عنداللہ قرآن مجید کسی خاص ترتیب کے ساتھ پہلے سے مرتب ومکتوب اور محفوظ نہ تھا۔ بلکہ صورت یہ ہوئی کہ قرآن ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لیکر اپنی انتہائی تکمیل تک تئیس سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی انکی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے" ایسے غیر متعین اور ہنگامی حالات میں ظاہر ہے کہ ہم میں سے کوئی انسان بھی ان مختلف النوع اور مختلف الاحوال احکام میں وہ تصنیفی ترتیب کیسے قائم کرسکتا ہے جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کیلئے کسی مقالہ میں

اختیار کیجاتی ہے تو جو بات ہم انسانوں میں سے کوئی بھلی انجام نہ دے سکے اس بات کی اللہ تعالیٰ سے انجام دہی کا تصور کیسے قائم کرلیا جائے، توبہ توبہ سو بار توبہ۔

یہ ہے علامہ کی نگارش جمیل کا ایک نمونہ اور یہ ہے موصوف کی جادو نگاری کا فتنہ! افسوس کہ انکی امت مسلمہ کے افراد موصوف کی ایسی ہی عبارتوں پر سر دھنتے ہیں اور بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ تفہیم القرآن سے بہتر کوئی تفسیر قرآن فہمی کے لئے آجتک وجود ہی میں نہیں آئی

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی

آپ کو چاہے اتفاق ہو یا نہ ہو مجھے کہنا یہی ہے کہ علامہ نے اس طرح قرآن مجید کا تقابل ڈاکٹر میٹ کے مقالہ سے فرما کر صرف ولایت سے اپنی مرعوبیت ہی کا ثبوت فراہم فرمایا ہے ورنہ اہل سعادت و ادب اور اہل ایمان و احسان ایسے موازنہ و تقابل کو منافی ایمان و ادب تصور کرتے ہیں مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے اور بقول شخصے یہی کہنا پڑتا ہے ؎

صفائی روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں
کہ کالج میں کوئی اس علم کا ماہر نہیں ہوتا

یہ ارشاد سراسر خلاف واقعہ ہے

علامہ نے اپنے مقدمہ تفہیم میں قرآن مجید کے موضوع، مرکزی مضمون اور مدعا کا تعارف فرما دینے کے بعد قرآن مجید کی "کیفیت نزول" کو اپنا موضوع بحث

بتایا' ارشاد فرماتے ہیں :-

(۹) "اللہ تعالےٰ نے عرب کے شہر مکہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کیلئے منتخب کیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدار کرے (مقدمہ ص۲۱)

علامہ کا یہ مندرجہ بالا ارشاد سراسر خلاف واقعہ ہے کیونکہ صحیح صورت واقعہ تو یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہر مکہ میں اپنے جس بندے کو پیغمبری کی خدمت کیلئے منتخب کیا تھا اسے سب سے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اقراء باسم ربك الذی خلق ہ خلق الانسان من علق ہ اقراء و ربك الاکرم الذی علم بالقلم ہ علم الانسان مالم یعلم ہ (اسے نبی) آپ اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھیں جس نے سب کو پیدا کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیں اور آپ کا پروردگار بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ بے علم تھا۔

سورۂ علق (اقرار) کی یہ مندرجہ بالا پانچ آیات پہلی وحی کی تعلیمات ہیں اور یہ تاریخی حقیقت اتنی مشہور ہے کہ تقریبًا ہر وہ انسان اس سے باخبر ہے جو دین کی معمولی شدبدھ بھی رکھتا ہے بلکہ خود علامہ مودودی بھی سورۂ العلق کی تفسیر (پارۂ عم) میں ان آیات کو پہلی وحی تسلیم فرما رہے ہیں۔

ایسی صورت میں علامہ نے دعوت اسلام کی اصل ترتیب کو محض اپنے ذہنی منصوبہ کے مطابق ثابت کرنے کے لئے کار نبوت کو جس ترتیب سے پیش فرمایا ہے وہ خلاف واقعہ ہونے کے باعث موصوف کیلئے مفید مدعا ہرگز نہیں۔

یہ بات یہاں تک تو صحیح ہے کہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اثنار دعوت یہ ہدایت

بھی ملی تھی کہ آپ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کریں لیکن یہ ہدایت پہلے نمبر پر ہرگز نہیں دی گئی ہے جیسا کہ موصوف اپنی منصوبہ بند تحریر میں ارشاد فرما رہے ہیں۔

مقصد در اصل یہ ہے کہ چونکہ علامہ کو تو یہ دھن لگی ہوئی ہے کہ کسی طرح اصل دعوت اسلام اور کیفیت نزول کو ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی طرح باقاعدہ مرحلہ وار مرتب انداز میں پیش کر دیں ہو سکتا ہے اسی طرح انھیں دیباچۂ تفہیم اور مقدمۂ تفہیم ہی تحریر فرمانے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے اس لئے موصوف قرآن مجید کی کیفیت نزول کو بھی اصل صورت حال سے قطع نظر فرماتے ہوئے صرف اپنے منصوبہ کے مطابق ہی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پوری تفسیر میں شان نزول کی بیشتر بحثیں موصوف نے اپنے منصوبہ کے مطابق ہی تحریر فرمائی ہیں، جنکی تفصیلات انشاء اللہ تعالیٰ اپنے اپنے موقع پر پیش کیجاتی رہیں گی۔

عبارت بالا کے بعد ہی متصلاً اسی کیفیت نزول پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

(۱۰) "یہ کام شروع کرنے کیلئے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں (۱) پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کار کیلئے کس طرح تیار کرے (۲) حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں جنکی وجہ سے انکا رویہ غلط ہو رہا تھا (۳) "صحیح رویہ" کی طرف دعوت اور

"ہدایت الٰہی" کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جسکی پیروی میں
انسان کی فلاح و سعادت ہے" (بمقدمۂ تفہیم ص۲۱)

نہایت افسوس کے ساتھ

کہنا پڑتا ہے کہ موصوف ڈاکٹر مودودی صاحب قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" کو موضوع بحث اور "نشانہ تنقید" اس حد تک بنائے ہوئے ہیں کہ انھیں قرآن مجید کو ڈاکٹریٹ کے مقالہ سے کم معیار اور فروتر قرار دینے میں بھی کوئی باک نہیں محسوس ہوتا۔ کاش موصوف ڈاکٹر صاحب اپنے مقدمہ پر بھی ایسی ہی تنقیدی نظر ڈال لیتے تو شاید ہماری طرح خود انھیں نظر آجاتا کہ ان کا یہ مقدمہ جسے انھوں نے صرف اس لئے تحریر کیا ہے کہ وہ پہلے قرآن مجید کو "بے ترتیبی" "بے اسلوبی" "تشنگی بیان" اور "تکرار مضامین" وغیرہ جیسے نقائص اور اعتراضات کا محل ثابت کریں اور بعد میں اپنی "کارگزاری" کی نمائش میں ہر نقص و اعتراض کو اپنی نگارشات جمیل کے ذریعہ دور فرمانے کی بھی کوشش فرمائیں مگر افسوس صد افسوس کہ موصوف کا یہ مقدمہ بھی اپنے تہ دامن وہی سب عیوب و نقائص چھپائے ہوئے ہے جسے وہ قرآن مجید میں دکھلانا چاہتے ہیں۔

موصوف نے "کیفیت نزول" کو سمجھانے کیلئے کل زمانۂ نزول کو تین مرحلوں میں تقسیم فرماکر ہر مرحلہ سے متعلق مضامین ہدایت کی صرف تعیین فرمائی ہے حالانکہ ضرورت یہ بھی تھی کہ موصوف اپنے تعمق مطالعہ اور تدبر قرآن کو اپنے ناظرین اور معتقدین پر مزید روشن و آشکارا فرمانے کیلئے ہر مرحلہ سے متعلق آیات قرآنی کی کچھ مثالیں بھی نقد ہی پیش فرما دیتے

جیسا کہ ڈاکٹریٹ کے لئے لکھے گئے مقالوں میں ہوتا ہے۔ ان مقالوں میں یہ تشنگی اور بیقاعدگی نہیں ہوتی جو علامہ نے اپنے اس مقدمہ میں روا رکھی ہے ان میں یا تو اسی جگہ مثال دیدی جاتی ہے اور کہیں اگر اختصار مدنظر ہوتا ہے تو کم از کم مثالوں کا حوالہ تو اسی جگہ دیدیا جاتا ہے۔ علامہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کرنا تھا کہ وہ دعوت کے ہر مرحلہ سے متعلق مضامین کی ہدایات کی کچھ مثالیں بھی یہیں بیان فرما دیتے کہ مضمون ۱ کی مثالیں فلاں فلاں سورتوں کی فلاں فلاں آیات ہیں اور مضمون ۲ کی مثالیں فلاں فلاں آیات اور مضمون ۳ کی مثالیں فلاں فلاں آیات ہیں تب کہیں جاکر موصوف کا یہ مقدمہ ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی حیثیت کا ہو سکتا تھا لیکن موصوف نے یہ صورت اختیار نہ فرمائی بلکہ کیا بھی تو صرف یہ کیا کہ اپنی "تحریک مودودیت" کو منظر عام پر لانے سے پہلے انھوں نے جو منصوبہ اسکے لئے تیار کیا تھا اور جس کو برپا کرنے کیلئے "دارالاسلام" کی تخلیق فرمائی تھی اسی منصوبے کے "چوکھٹے" میں اصل دعوت اسلام اور قرآن مجید کی "کیفیت نزول" کو کسی طرح فٹ کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ انکی یہ اپنی تحریک بھی بالکل اسی اصلی دعوت اسلام کے خطوط پر اور اسکی صحیح نقل مطابق اصل اور اسکا اکلوتا نمونہ ہے مگر ظاہر ہے کہ کہاں وہ اصل دعوت اسلام جسکا نقشہ اور منصوبہ لوح محفوظ میں تیار ہوکر وہیں مکتوب و محفوظ رہا اور وقت مقررہ پر خداوند عالم کی ہدایات کے مطابق نزول قرآن کے ذریعہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ کیطرف منتقل اور آپکے ذریعہ دنیا میں شایع و برپا ہوتا رہا اور کہاں علامہ موصوف کی اپنی یہ تحریک جو ان کے اپنے ذہن و فکر کی پیداوار اور انکی تجدد پسندی کا شاہکار ہے جسکا نقشہ و منصوبہ پٹھان کوٹ میں مرتب و تیار ہوا ہو ان دونوں منصوبوں میں مطابقت و یکسانیت پیدا کردینا اور انسانی دماغ

"جو کھے" میں اللہ تعالیٰ کے الہامی منصوبۂ دعوت کو نٹ کر دینا کسی بھی علامہ یا پروفیسر کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ موصوف ڈاکٹریٹ کیلئے لکھے گئے مقالہ کو آئیڈیل اور مثالی تسلیم فرما لینے کے باوجود اپنے مقدمۂ تفہیم میں ان مقالوں جیسی ترتیب و تہذیب ملحوظ نہ رکھ سکے اور دعوت اسلام کی مرحلہ وار تقسیم تو فرمادی لیکن کیفیت نزول کے بیان میں اپنے متعینہ موضوعات و مضامین سہ گانہ کو مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین اور مستحکم نہ فرما سکے

بہت ممکن ہے موصوف اپنی کسی بات کو دلیل اور مثال کے ذریعہ مستحکم فرمانا ضروری نہ خیال فرماتے ہوں کیونکہ انکی اپنی "امت مسلمہ" تمام علمائے امت کو مستحق تنبیہ سمجھ لینے کے بعد خود آں موصوف کو تو ماوراۓ تنقید تصور کرتی ہی ہے اور انکی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کیلئے ہر وقت گوش بر آواز رہتی ہی ہے

تفسیر نویسی ٹیڑھی کھیر نکلی

مقدمۂ تفہیم میں علامہ کا یہ انداز روا روی، موصوف کا یہ اشارات و اختصار اور دلائل و امثلہ سے یوں صرف نظر ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے یہ تفہیم یا تو صرف اپنے انھیں معتقدین اور مومنین صادقین کیلئے تحریر فرمائی ہے جو اپنی ذہنی غلامی اور نیاز مندی کے باعث اپنے "مرشد" سے کسی قسم کے مطالبۂ ثبوت و دلیل کے قائل ہی نہ ہوں گے یا پھر علامہ کے مخاطب صرف وہ حضرات ہیں جنھیں قرآن مجید اور اس سے متعلق تمام ضروری معلومات پوری طرح مستحضر اور پیش نظر ہوں اور ان کیلئے یہ مبہم سے اشارات ہی کافی ہوں لیکن ایک عام ناظر تو اس قسم کے اشاروں سے ہرگز

مطمئن نہو سکے گا بلکہ علامہ کی اس مرحلہ وار تقسیم کو نزول قرآن کی مثالوں سے بھی سمجھنا چاہے گا مگر افسوس کہ علامہ ایسے عام ناظر قرآن ہی کو نظر انداز فرما گئے۔ حالانکہ علامہ نے اپنے دیباچہ تفہیم میں ناظرین کو یہی امید دلائی تھی کہ وہ اپنی یہ تفسیر متوسط درجہ کے لوگوں ہی کیلئے تحریر فرمارہے ہیں، ملاحظہ ہو ارشاد فرماتے ہیں۔

" میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے جن کے لئے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہے انہی کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے (دیباچہ تفہیم ص۶)

یا پھر قصہ ہی یہ ہے

کہ علامہ نے اپنے ذہنی و فکری طور پر تو اپنے منصوبہ تحریک کے مطابق اصل دعوت اسلام اور کیفیت نزول قرآن کی مرحلہ وار کی تقسیم اور" ترتیب کار " مرتب متعین فرمالی اور پھر مقدمہ تفہیم کے صفحات میں اسے کاغذی وجود بھی بخش دیا مگر جب وقت آیا کہ اب ہر مرحلہ دعوت پر موضوع و مضمون سے متعلق آیات قرآنی اور ہدایات ربانی کو بھی اپنے خانہ ساز چوکھٹے میں فٹ کرکے علی رؤس الاشہاد (سب کے سامنے اسکی نمائش بھی کردیں تو موصوف کو اندازہ ہوا کہ تفسیر نویسی اور اسکے لئے اس قسم کی مقدمہ نگاری کوئی معمولی کھیر نہیں ہے یہ تو خاصی" ٹیڑھی کھیر " ہے۔

اب علامہ کو عافیت اسمیں نظر آئی کہ وہ نزول قرآن سے متعلق صرف اپنا ذہنی منصوبہ اور کاغذی نقشہ تو پیش کردیں مگر اسے مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین د

مستحکم کرنے اور سمجھانے کی کوشش ہرگز ہرگز نہ کریں کہ یہ بات عملی طور پر ان کے لئے بہت مشکل ہے جیسا کہ آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم پوری تفصیل سے عرض کریں گے۔

توضیح و تمثیل

سطور بالا میں علامہ مودودی کی مقدمہ نگاری میں جس قسم کے نقص و عیب کا ذکر کیا گیا ہے ممکن ہے بعض حضرات راقم السطور کے اس نقد و تبصرہ میں وہی خامی و تشنگی محسوس فرمائیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اپنے مدعا کی قدرے توضیح بھی پیش کر دی جائے۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ اصل دعوت اسلام اور کار نبوت کا آغاز تو اسوقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت نبوت کے لئے منتخب فرمانے کے بعد پہلی وحی کے ذریعہ پہلا حکم نازل فرمایا۔ وہ حکم کیا تھا؟ "اقرأ باسم ربك" اے نبی آپ اپنے رب کا نام لیکر پڑھیں یعنی آغاز نبوت ہی میں آپ کو اشارتاً یہ اطلاع دیدی گئی تھی کہ آپ کو ایک کتاب پڑھنا ہے۔ انہی ابتدائی آیات میں علم و تعلیم اور قلم و کتابت (علم سے متعلق متعدد چیزوں) کا تعارف بھی کرا دیا گیا تھا نیز تخلیق انسانی اور مادۂ تخلیق کا ذکر بھی فرما دیا گیا تھا۔

علامہ مودودی صاحب کو دھن یہ ہے کہ وہ نزول قرآن کی کیفیت اپنے منصوبہ کے تحت پیش کریں اسی لئے وہ دعوت اسلام کے تین مرحلوں میں نازل ہونے والی ہدایات کو اپنے مفروضہ منصوبہ کے مطابق پیش کر رہے ہیں جس کا نتیجہ

Scanned with CamScanner

یہ ہوا کہ موصوف نے دعوت کے پہلے مرحلہ میں اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتدا ر کرنے کی بات تحریر فرمادی حالانکہ وہ حکم آغاز نبوت کے کافی بعد نازل ہوا تھا۔

موصوف نے جن الفاظ میں وہ حکم ذکر فرمایا ہے وہ چونکہ بغیر آیت قرآنی صرف مفہوم پر مشتمل ہے اسلئے یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ موصوف نے کس آیت قرآنی کا مفہوم یوں نقل فرمایا ہے :۔

"اپنے شہر اور اپنے قبیلہ سے دعوت کی ابتدا کریں"

قرآن مجید کے الفاظ اور ترتیب نزول دونوں ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو یہ حکم تو آغاز نبوت کے بہت بعد کا ثابت ہو سکے گا کیونکہ ظاہر الفاظ کو دیکھتے ہوئے علامہ کا نقل کردہ مفہوم وَانذِر عَشِیرَتَكَ الاقربین ٥ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جو سورۂ شعراء کی مشہور آیت ہے اور سورۂ شعراء ترتیب نزول کے اعتبار سے بہت بعد کی سورہ ہے۔

اگر علامہ کے نقل کردہ مفہوم میں کچھ مسامحت سے کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ موصوف نے شاید سورۂ مدثر کی آیت "قُم فَاَنذِر" (آپ انذار و تبلیغ کیلئے اٹھ کھڑے ہوں) کے عام حکم میں اپنے منصوبہ اور اپنی مفروضہ ترتیب کا رکو ملحوظ رکھتے ہوئے "اپنے شہر اور اپنے قبیلہ" کا اضافہ اپنی جانب سے فرما دیا ہوگا اور مراد انکی یہی سورۂ مدثر کی آیت ہوگی۔

بہر صورت یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ ترتیب نزول قرآن کو علامہ اپنے منصوبہ کے مطابق بنا کر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی مشہور ترتیب تو کچھ اسطرح ہوئی ہے :۔

Scanned with CamScanner

(۱) سورۂ علق (۲) سورۂ قلم کی کچھ آیات (۳) سورۂ مزمل کی چند آیات (۴) سورۂ مدثر کی کچھ آیات (۵) سورۂ فاتحہ ——— اس اجمال کی تفصیل اس طرح پیش کیجا سکتی ہے :۔ (سورتوں کی ترتیب نزول اتقان کے قول پر متعین کی گئی ہے)

آغاز نبوت میں ابتدائی آیات اور "بنیادی تعلیمات"

پہلی وحی: (اے نبی) آپ اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھیں جس نے سب کو پیدا کیا، انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا، آپ پڑھیں اور آپ کا رب بہت کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیا جس سے وہ بے علم تھا (سورۂ علق آیات ۱تا ۵)

نٓ قسم ہے قلم کی اور اس کے لکھنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں اور بیشک آپ کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں سو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کس کو جنون تھا۔ آپ کا پروردگار اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اسکی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ اور وہ راہ چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے، تو آپ ان تکذیب کرنے والوں (جھٹلانے والوں کا) کہنا نہ مانیئے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں۔ آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو، بے وقعت ہو طعنہ

دینے والا ہو۔ چغلیاں لگاتا پھرتا ہو، نیک کام سے روکنے والا ہو، حد سے گزرنے والا ہو۔ گناہوں کا کرنے والا ہو۔ سخت مزاج ہو۔ اسکے علاوہ بدذات ہو۔ اس سبب سے کہ مال واولاد والا ہو جب ہماری آیتیں اسکے سامنے پڑھکر سنائی جائیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں ہیں، ہم عنقریب انکی ناک پر داغ لگا دیں گے (سورۂ قلم ۱۶ آیات)

● اے نبی جو کملی اوڑھے ہوئے ہو رات کو (خدا کے آگے) کھڑے ہو جایا کرو، آدھی رات کو یا کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو آہستہ آہستہ پڑھا کرو، ہم عنقریب تم پر بھاری فرمان نازل کریں گے، اس میں کچھ شک نہیں کہ رات کا قیام نفس بہیمی کو سخت پامال کرتا ہے (اسوقت دل وزبان کا خوب میل ہوتا ہے) اسوقت ذکر بلکل خوب درست ہوتا ہے، دن کے وقت تو تمھیں اور بہت سے کام ہوتے ہیں۔ تم اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسکی طرف متوجہ ہو جاؤ وہی مشرق و مغرب کا مالک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بناؤ اور جو دل آزار باتیں یہ لوگ کہتے ہیں انکو سہتے رہو اور اچھے طور پر ان سے الگ ہو جاؤ اور مجھے ان جھٹلانے والوں سے جو دولت مند ہیں سمجھ لینے دو اور انکو تھوڑی سی مہلت دیدو۔ (سورۂ مزمل ۱۱ آیات)

● اے جو کپڑا لپیٹے ہوئے ہو اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے رب کی بڑائی کرو اور کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو اور اس نیت سے احسان نکرو کہ اس سے زیادہ بدلہ چاہو، اور اپنے پروردگار کیلئے صبر کرو، جب صور پھونکا جائے گا وہ دن مشکل کا دن ہو گا یعنی کافروں پر آسان نہ ہو گا، ہمیں اس شخص سے سمجھ لینے دو جکو

ہم نے اکیلا پیدا کیا اور مال کثیر دیا اور ہر وقت اسکے پاس جا کر رہنے والے بیٹے وسیئے اور ہر طرح کے سامان میں وسعت دی اُبکی خواہش رکھتا ہے کہ اور زیادہ دیں، ایسا ہر گز نہیں ہوگا یہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے ہم اسے صعود پر چڑھائیں گے (سورۂ مدثر ۱۷ آیات)

● سب تعریفیں اللہ ہی کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر عالم کے، جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روز جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے اعانت کی درخواست کرتے ہیں، بتلا دیجئے ہم کو رستہ سیدھا، رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے (سورۂ فاتحہ مکمل)

یہ ابتدائی پانچ سورتوں کی چند آیات کے مضامین ہیں جو اعلان نبوت کے بعد ہی بالکل ابتدائی دور میں بالترتیب اسی طرح نازل ہوئیں انکا پس منظر بھی بہت کچھ تو ان آیات ہی میں غور کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان آیات کا مطلب بھی بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔ راقم السطور کے پیش نظر اسوقت ان کے پس منظر اور تفصیلی مطلب سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ اصل مقصد تو اس امر کی توضیح ہے کہ ناظرین غور فرما کر خود ہی ملاحظہ فرمالیں کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کے بنیادی عقائد (یعنی توحید باری تعالیٰ، نبوت محمدی نیز عقیدۂ آخرت مع سزا و جزا وغیرہ اور بعض عبادات نیز اصولِ اخلاق حسنہ وغیرہ کی تعلیم و ہدایت فرمائی گئی ہے لیکن علامہ مودودی جو صرف قرآن فہمی کی راہیں کشادہ

فرمانے میں کوشاں نظر آتے ہیں انکے نزدیک ان ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں عقائد و عبادات کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے جیسا کہ اشارۃً پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے موصوف اپنے مقدمہ میں پہلے فرما چکے ہیں :-

"ان سب کا ایک ہی دین تھا ——— وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے یعنی اخلاق و تمدن کے وہ ازلی و ابدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کیلئے تجویز کر دیئے گئے تھے"

اور یہاں بھی فرما رہے ہیں

"صحیح رویہ کی طرف دعوت اور ہدایت الٰہی کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جنکی پیروی میں انسان کیلئے فلاح و سعادت ہے" (مقدمہ تفہیم صـ۲۱)

آخر ایسا کیوں ہے ؟

اصحاب علم و حکمت اور ارباب نظر و انصاف کو غور فرمانا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ علامہ مودودی صاحب دین کے بنیادی عقائد (اثبات توحید و ابطال شرکت، رسالت و نبوت اور عقیدۂ آخرت وغیرہ) نیز بنیادی عبادات نماز و ذکر خالق وغیرہ سے صرف نظر کیوں فرما رہے ہیں اور دین کی یہ بنیادی تعلیمات موصوف کے نزدیک قرآن مجید کی ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں جگہ کیوں نہ پا سکیں ؟ اور موصوف نے سارا زور قلم اصولِ اخلاق اور اصول تمدن کی اہمیت پر ہی کیوں صرف فرما دیا ؟ کیا اسکی وجہ یہ متعین نہیں ہو جاتی کہ موصوف کے نزدیک عقائد و عبادات کو واقعتاً

وہ اہمیت حاصل ہی نہیں ہے جو درحقیقت ہونی چاہیئے ۔ ملاحظہ ہو! موصوف فرماتے ہیں : ۔

(الف) "آپ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ باندھکر قبلہ رخ کھڑے ہونا گھٹنوں پر ہاتھ رکھکر جھکنا، زمین پر ہاتھ ٹیک کر سجدہ کرنا اور چند مقررہ الفاظ زبان سے ادا کرنا بس یہی افعال اور حرکات بجائے خود عبادت ہیں ۔ آپ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی پہلی تاریخ سے ۔۔۔ روزانہ صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہنے کا نام عبادت ہے ۔۔۔۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مکہ معظمہ جاکر کعبے کے گرد طواف کرنے کا نام عبادت ہے ۔ غرض آپ نے افعال کی چند ظاہری شکلوں کا نام عبادت رکھ چھوڑا ہے ۔۔۔۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جس عبادت کیلئے آپ کو پیدا کیا ہے اور جس کا آپ کو حکم دیا ہے وہ کچھ اور ہی چیز ہے" (خطبات ص۸۷، ۸۸)

آپ پوچھیں گے کہ نماز روزہ اور حج وغیرہ کیا چیز ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں انکا مقصد آپکو اس بڑی عبادت کیلئے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہیئے" (ص۸۹ خطبات مطبوعہ دارالاسلام)

(ب) " اس غلط مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اسکی عبادات محض پوجا پاٹ بنا کر رکھدی گئیں، حالانکہ وہ ان ذہنی و اخلاقی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام

سے اپنا نظام اجتماعی تعمیر کیا ہے" (ترجمان القرآن ج ۱۷، ص ۲۶۱)

علامہ کی مندرجہ بالا تحریرات تو وہ ہیں جن میں موصوف اپنے نظریہ کے مطابق عبادت کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش فرمائی ہے ـــ اب ایک ایسی تحریر بھی ملاحظہ ہو جسمیں عبادت کا استہزا ہے اور مضحکہ اڑایا گیا ہے:۔

"آپ ان کے منھ پر پورے ناپ کی داڑھیاں دیکھکر انکے ٹخنوں سے دو دو انچ اونچے پاجامے دیکھکر انکی پیشانیوں پر نماز کے گٹے دیکھکر اور انکی لمبی لمبی نمازیں اور موٹی موٹی تسبیحیں دیکھکر سمجھتے ہیں کہ بڑے دیندار اور عبادت گذار ہیں یہ غلط فہمی بھی اسی وجہ سے ہے کہ آپ نے عبادت اور دینداری کا مطلب ہی غلط سمجھا ہے" (خطبات ص۸، دارالاسلام)

علامہ کے خطبات کے مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف یا تو غلامی اور بندگی کے مابین پائے جانے والے عظیم فرق کو بے خبری اور بے شعوری میں نظر انداز فرما گئے ہیں یا پھر دانستہ تجاہل فرماتے ہوئے غلط مبحث کے ذریعہ اپنے افکار و نظریات کی تبلیغ و ترویج چاہتے ہیں ویسے گمانِ غالب تو یہی ہے کہ علامہ جیسا "مجتہد مطلق" "غلامی" اور بندگی کے درمیانی فرق سے بے خبر ہرگز نہ ہوگا۔ ہاں جہاں تک تجاہل برت کر خلط مبحث کرنے کی بات ہے اس الزام سے علامہ کو محفوظ رکھنے کیلئے حسن ظن کی فراہمی ضرور مشکل نظر آتی ہے۔

علامہ کے دین پر بھی ایک نظر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں علامہ کی "تشریح دین" پر بھی

ایک نظر ڈال لی جائے کیونکہ عبادت کی طرح علامہ کا "دین" بھی جمہور علماء کے دین سے مختلف ہے۔ موصوف نے اپنے دین پر روشنی بھی مختلف مقامات پر ڈالی ہے چنانچہ خطبات میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

(الف) "دین "دراصل" حکومت" کا نام ہے" (خطبات ص۲۳۵ خطبہ جہاد)

(ب) "حکومت" کے بغیر "دین" بالکل ایسا ہے جیسے ایک عمارت کا نقشہ آپ کے دماغ میں ہو مگر عمارت زمین پر موجود نہ ہو"۔۔۔۔ جسطرح خیالی نقشے کا نام عمارت نہیں اسی طرح خیالی دین کا نام بھی دین نہیں ہے" (خطبات خطبۂ جہاد ص۲۴۱ سطر ۱۰ و ۱۲ و ۱۳)

(ج) اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ (قرآن) لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے مراد ایک نظام زندگی لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اسکی اطاعت اور فرماں برداری قبول کر کے اسکے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے (چار بنیادی اصطلاحیں ص۱۶۸)۔

علامہ کے انھیں بنیادی تصورات اور انکا رو نظریات نے نہ صرف "مقدمۂ تفہیم" بلکہ انکی دوسری تصنیفات میں بھی موصوف کو اسلامی عقائد و عبادات کو ثانوی درجہ میں ہی رکھنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ علامہ نے جس طرح اسلامی عقائد و عبادات کو یہاں مقدمۂ تفہیم میں نظر انداز فرمایا ہے اسی طرح اپنے خطبات میں بھی متعدد مقامات پر یہی روش اختیار فرمائی ہے۔ اس سلسلہ میں موصوف کی تحریروں کے بعض اقتباسات حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم کی تازہ تصنیف " عصر حاضر میں دین کی

Scanned with CamScanner

تفہیم وتشریح" کے حوالے سے نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو فرماتے ہیں: ــ

(الف) "اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایک ایسی "جماعت"

بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر وفلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے"

(اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر حصہ اول)

(ب) "اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کیلئے انبیاء

علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے" (تجدید احیاء دین ص۱۲)

(ج) "پس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود

یہ رہا ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کر کے اس پورے نظام زندگی کو نافذ

کر دیں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے" (تجدید احیاء دین ص۱۲)

(د) "اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے

کی کوشش کی بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام (حضرت آدم و نوح و شعیب علیہ السلام

کس طبقہ میں گئے یہ نہ ارشاد فرمایا) اور بعض نے انقلابی تحریک شروع

کر دی مگر حکومت الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی انکا کام ختم ہو گیا

جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل

تک پہونچا دیا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم"

(تجدید واحیاء دین ص۲۲)

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم نے علامہ کے ان اقتباسات کو

کو نقل فرمانے سے پہلے یہ سوال بھی قائم فرمایا ہے: ــ

"ان اقتباسات پر نظر ڈالی جائے اور رائے قائم کیجائے
کہ فکر کے اس سانچہ سے کس طرح کے دل و دماغ ڈھل کر نکلیں گے"؟
دیکھئے علامہ اور ان کے متبعین اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں ؟ — اقتباسات
مندرجہ بالا نقل فرمانے کے بعد حضرت مولانا ندوی فرماتے ہیں :-

"اسی کے ساتھ اس بات کا اضافہ کیجئے کہ مصنف و داعی پر
یہ مرکزی خیال اتنا مستولی ہو جاتا ہے کہ اسکو تمام اسلامی عبادات
اور اسلام کے ارکان اربعہ نماز ، روزہ ، حج ، زکوٰۃ سب اسی
مقصد اصلی کے حصول کے وسائل و ذرائع اور اسکے لئے
مشق و تمرین نظر آنے لگتے ہیں" (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں)
"حالانکہ قرآن شریف اسکے برعکس جہاد و حکومت کو وسیلہ اور "اقامت
صلوٰۃ" کو مقصد و نتیجہ بتاتا ہے" (اگلے صفحہ پر فرماتے ہیں) "وسائل
سے قدرتاً ایک ضابطہ اور ضرورت کا تعلق ہوتا ہے اور انکو ایک
عبوری مرحلہ سمجھنے کا ذہن پیدا ہونا ناگزیر ہے . انسان میں انکے
بارے میں ترقی کرنے ، انکے مراتب عالیہ تک پہونچنے کا ذوق و فکر
اور اس سے لذت و سکون حاصل کرنے کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا" (اور
آگے چل کر فرماتے ہیں) "وسائل سے بقدر ضرورت اشتغال
ہوتا ہے ان سے شغف اور ان میں انہماک پیدا نہیں ہوتا" (اور
آگے چل کر فرماتے ہیں) "اس طرز فکر کا نتیجہ ہے کہ عبادات سے قلبی تعلق
ان میں روح اور کیفیت پیدا کرنے ، اپنے اندر خشوع و خضوع ، اخبات

وانابت، استحضار، دوام ذکر، اخلاص وایمان واحتساب کی دائمی کیفیت پیدا کرنے کا جذبۂ صادق ہی نہیں پیدا ہوتا"

("عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح" بطور اختصار از ص ۷۷ تا ۸۳)

حضرت مولانا ندوی نے اپنی مندرجہ بالا تحریرات سے پہلے ہی بالکل بجا طور پہ یہ حقیقت کھلی بیر دقلم فرمادی ہے :-

"اس طرز فکر اور طرز تحریر سے (جس کے کچھ نمونے اوپر پیش کئے گئے ہیں) اندیشہ پیدا ہوتا ہے (اور اسکے آثار علامات ظاہر ہو چکی ہیں) کہ جن لوگوں کے دینی معلومات اور اسلام سے واقفیت کا تنہا ذریعہ اسلام کی یہی تفہیم وتشریح ہوگی انکا تعلق اللہ کی ذات سے ایک محدود، خشک، بے روح اور ضابطہ کا تعلق ہوگا جوان اندرونی کیفیات سے خالی ہوگا جو مومن سے مطلوب ہیں خصوصیت کیساتھ جب بار بار انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اور انکی تعلیمات کا ماحصل (بلکہ منتہائے مقصود) اسی دنیا اور اسکی محدود زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے صالح انقلاب لانے اور انسانی تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کو قرار دیا جائے اور اسکو بار بار پوری بلند آہنگی سے اس طرح بیان کیا جائے کہ محبت و رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے تصورات و توقعات اسکے نیچے دب کر رہ جائیں، تو یہ امر بالکل قدرتی ہے اور اسکا نتیجہ بالکل خلاف عقل وفطرت نہیں ہے کہ ذکر واہتمام وسعی وعمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب شوق آخرت، طلب محبت ورضا کی اس پٹری سے ہٹکر

جس پر انبیا رعلیہم السلام اسکو ڈالتے ہیں طلب عزت وغلبہ اور شوقِ اقتدار

اور بالاختصار مادیت کی پٹری پر پڑ جائے۔

(عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح ف)

ناظرین کرام اپنے ذہن سے موضوع بحث اور اپنے ہاتھ سے سر رشتہ مضمون جانے نہ دیں

علامہ کے نظریۂ دین کی تفہیم وتشریح میں حضرت مولانا علی میاں ندوی دامت برکاتہم کے طویل اقتباسات کلی اپنے موضوع بحث ہی سے متعلق تھے اس لئے امید تو یہی ہے کہ ناظرین تبصرہ کے ذہن میں مقدمہ تفہیم کا وہ اقتباس محفوظ ہوگا جو چند صفحات پہلے "مقدمہ تفہیم" ص۱۸ و ص۲۱ سے نقل کیا جا چکا ہے۔

علامہ نے اپنے ان اقتباسات کے ذریعہ قرآن فہمی کے نام پر یہی خدمت انجام دینی چاہی ہے جس کا اندیشہ مولانا ندوی صاحب محسوس فرمارہے ہیں کہ :۔

"فکر واہتمام وسعی وعمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب، شوق آخرت طلب محبت ورضا کی اس پٹری سے ہٹ کر جس پر انبیا رعلیہم السلام اسکو ڈلتے ہیں طلب عزت وغلبہ اور شوق اقتدار اور بالاختصار مادیت کی پٹری پر پڑ جائے۔"

فقہ وفتویٰ کی زبان میں

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم اپنی تازہ تصنیف میں جس کے اقتباسات

اوپر نقل ہوئے اپنی مخصوص متانت وسنجیدگی کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:۔

"پیش نظر کتاب ——— نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے نہ فقہ وفتویٰ کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور "الدین النصیحۃ" کے حکم پر عمل کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ——— اس ناخوشگوار کام کو (خدا علیم وخبیر ہے کہ) عنداللہ مسئولیت اور شہادت حق کے خیال سے انجام دیا گیا (مختصراً ص۱۵ وص۱۶)

حضرت مولانا ندوی دامت برکاتہم اپنی متانت وسنجیدگی یا اپنی انکسار وفروتنی کے باعث کتاب کو فقہ وفتویٰ کی زبان واصطلاح سے علیحدہ رکھیں یہ حق یقیناً انھیں حاصل ہے لیکن راقم السطور اسی مسئولیت عنداللہ اور شہادت حق کے تحت اپنے لئے ایسے موقع پر زبان فقہ وفتویٰ اور غیر زبان فقہ وفتویٰ کی تفریق بھی مصلحت دین کے خلاف تصور کرتا ہے اور بالکل صاف اور بے لاگ طور پر عرض کردینا چاہتا ہے کہ "جب فکر واہتمام اور سعی وعمل کی پوری گاڑی ایمان بالغیب، شوق آخرت، طلب محبت ورضا کی اس پٹری سے ہٹ کر جس پر انبیاء علیہم السلام اسکو ڈالتے ہیں طلب عزت وحکومت اور شوق غلبہ واقتدار کی پٹری پر پڑجائے" ــــ تو اس قسم کی صورت حال کو "دین" کہنا سب سے بڑی "دنیاداری" ہے اور اس قسم کی حکومت کیلئے جدوجہد کرنا سب سے بڑھکر "طاغوت دوستی" ہے فماذا بعد الحق الا الضلال۔

تربیتِ خداوندی اور نصرت آسمانی سے صرفِ نظر اور چشم پوشی

قرآن مجید کی ترتیب نزول اور کیفیت نزول سے بحث فرماتے ہوئے علامہ نے

اپنے مقدمہ میں ارشاد فرمایا ہے اس کے بعض اقتباسات اور ان پر اپنے کچھ تبصرے اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم مقدمہ تفہیم کا ایک اقتباس جس پر بعض پہلوؤں سے تبصرہ بھی ہو چکا ہے بعض دوسرے پہلوؤں سے تبصرہ کرنے کیلئے پیش کرتے ہیں۔ علامہ موصوف دعوت اسلام کے دور آغاز سے بحث فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"یہ کام (دعوت) شروع کرنے کیلئے آغاز کار میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئی ہیں اور زیادہ تر تین مضمون پر مشتمل تھیں۔

" ایک[1] پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کیلئے کسطرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں"

" دوسرے[2] حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گردو پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے انکا رویہ غلط ہو رہا تھا۔"

" تیسرے[3] صحیح رویہ کی طرف دعوت اور ہدایت الہٰی کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کیلئے فلاح وسعادت ہے"

(مقدمہ تفہیم ص۲۱)

علامہ کے اس ارشاد میں "تشنگی" "خامی" پائے جانے اور بعض پہلوؤں سے خلاف واقعہ ہونے پر تبصرہ تو گذشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اب اس موقع پر علامہ کے متعین فرمودہ ہر سہ نمبروں پر نمبروار کچھ عرض کرنا ہے۔

ابتدائی ہدایات کا پہلا نمبر

اس نمبر میں علامہ نے جو کچھ فرمایا ہے بڑی حد تک صحیح و درست ہونے کے باوجود ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے جس کے لئے علامہ کی تحریک مودودیت بجا طور پر بدنام ہے۔

علامہ کے اس ارشاد کا تاثر کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ نبوت و دعوت کی انجام دہی صرف ان ہدایتوں پر عمل پیرا ہو جانے کا لازمی و منطقی نتیجہ تھی جن سے اللہ تعالیٰ نے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز کار ہی میں روشناس اور واقف کرا دیا تھا اس تعلیم قرآنی کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خصوصی تربیت و نصرت آپ کے شامل حال نہیں رہی کیونکہ علامہ موصوف کے الفاظ اس سلسلہ میں صرف یہ ہیں کہ "آپ اپنے آپ کو کس طرح تیار کریں" ظاہر ہے کہ ان الفاظ کا تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ آپؐ کی تیاری اس عظیم الشان کام کیلئے خود اپنے ہی علم و فہم اور جد و جہد کا نتیجہ تھی' اس میں اللہ تعالیٰ کی نصرت غیبی اور خصوصی تربیت یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہبی فضیلت اور صفت نبوت و رسالت کو مطلق دخل نہ تھا۔ علامہ کے ان ارشادات کے بین السطور یہ عبارت بھی پڑھی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید میں آئی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر کوئی بھی شخصیت اسی طرح کار دعوت انجام دے سکتی تھی۔

ممکن ہے بعض حضرات اسے راقم السطور کی بدگمانی پر محمول فرمائیں لیکن کیا کیا جائے موصوف کے لٹریچر میں پنہاں خطرناکیاں اور زہرناکیاں اسطرح

سامنے آتی رہتی ہیں کہ موصوف کی عبارات و تحریرات کو کما حقہٗ سمجھنے کا حق ہی ادا نہ ہو اگران میں پوشیدہ خطرنا کی کا نوٹس نہ لیا جائے اسلئے کہنا پڑتا ہے کہ راقم السطور نے اقتباس مندرجہ بالا میں پوشیدہ مودودیت (یعنی تربیت خداوندی سے صرف نظر) کا سراغ بالکل صحیح طور پر ہی لگایا ہے جسکی تائید "مقدمہ تفہیم" کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"یہ ایک دعوت و تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکالکر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لاکھڑا کیا، باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علمبرداران کفر و فسق و ضلالت سے اسکو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیٔ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا، گوشہ گوشہ سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیان حق سے انکی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافت الٰہیہ کے قیام تک پورے ۲۳ سال تک یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلہ پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اسکی ساری

حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں، اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لیکر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کر دیں اور جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئینگے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے اور حبش و طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لیکر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے، ابو جہل اور ابو لہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اوّلین (حضرت ابو بکرؓ، حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ جیسے حضرات) سے لیکر مولفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے، یہ ایک اور قسم کا "سلوک" ہے جس کو میں "سلوک قرآنی" کہتا ہوں اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اسکی جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ سورتیں اور آیتیں خود آکر آپ کو بتاتی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لیکر آئی تھیں۔

اسوقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو و معانی و بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اسکے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے"

(مقدمہ تفہیم ص۳۳ و ۴۴)

یہ زورِ قلم ہے یا قلمِ زور ہے؟

مقدمہ کا یہ طول طویل اقتباس جس میں علامہ نے اپنے زورِ قلم اور جادوئے تحریر کی خوب ہی نمائش فرمائی ہے ناظرین کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور عدل و انصاف کے فیصلہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا اس اقتباس میں وہ بات کھل کر سامنے نہیں آگئی جو اس سے پہلے اقتباس میں کسی قدر پوشیدہ طور پر کہی گئی تھی جس کا تاثر اور ماحصل یہی ہے کہ ابتدائے اسلام میں نبوت و رسالت کی بنیاد پر دعوت و تبلیغ کا جو کام انجام دیا گیا تھا وہ قرآن مجید کے ان ظاہری الفاظ ہی کی بدولت انجام دیا گیا تھا اس میں نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو کوئی دخل تھا نہ ہی اللہ تعالیٰ کی کوئی نصرت و تربیت شامل حال تھی۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نزول قرآن کے تقریباً چودہ سو سال بعد بھی اپنے زمانہ میں مکے اور حبش و طائف کی منزلیں بھی دیکھ رہے ہیں بدر و حنین کے معرکے بھی سر کر رہے ہیں، ابوجہل و ابولہب کی شرارتوں اور اذیت کوشیوں سے بھی گزر رہے ہیں، موصوف کو حضرات (ابوبکر و خدیجہ و علی و زید رضی اللہ عنہم جیسے) سابقین اولین بھی مل گئے اور "مولفۃ القلوب" بھی (یہ شاید وہ لوگ ہوں گے جو صرف تحصیل زر کی نیت سے وابستہ جماعت ہو جاتے ہوں)۔

چبھتا ہوا ایک سوال

ناظرین کرام نے ابھی چند سطروں پہلے علامہ کی پرزور صحافت کا ایک

طول طویل نمونہ ملاحظہ فرمایا ہے، علامہ نے تمثیل کے پردہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا؟ علامہ کے اقتباس بالا پر راقم السطور نے بطور تمثیل ہی مختصراً جو تبصرہ اشاروں میں کرنا چاہا ہے امید یہی ہے کہ اس پر بھی خاطر خواہ توجہ فرمائی گئی ہوگی۔

اسی سلسلہ میں بطور تجزیہ و تبصرہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ دور نبوت اور دعوت اسلام کے ابتدائی دور کی ساری تمثیلات تو علامہ نے ایک ہی سانس میں دوہرا دیں لیکن اصل صاحب قرآن حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور واسطۂ نزول قرآن حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس تمثیل میں بالکل ہی نظر انداز فرما گئے؟

دوسرا ایک قابل غور چبھتا ہوا سوال یہ ہے کہ ابتدائے دعوتِ اسلام میں جب کچھ حضرات صحابہؓ حبشہ کو ہجرت کر گئے ہیں اور وہاں نجاشی نے ابوسفیان کی شکایت پر تحقیق حال کرنی چاہی ہے تو منجملہ دوسرے سوالات کے اسکا ایک سوال یہ بھی تھا کہ اسلام میں شامل و داخل ہونے کے بعد پھر کوئی اپنے پرانے دین کی طرف واپس بھی لوٹتا ہے یا نہیں جسکا جواب یہ دیا گیا تھا کہ "جو کوئی مذہب اسلام میں داخل ہو جاتا ہے وہ پھر اپنے پرانے دین کی طرف نہیں لوٹتا" دورِ نبوت اور ابتدائے دعوتِ اسلام کی یہ تصویر و تمثیل علامہ اپنی "دعوت مودودیت کے سلسلے میں پیش کرتے سے کیوں عاجز رہ گئے؟ اور ان کے "سابقین اولین" جو انھیں متکلم اسلام کا لقب دیتے تھے انھیں امیر المومنین مان کر ان سے بیعت بھی ہوئے تھے وہ سب مرتد کیسے ہو گئے؟

"تحریک مودودیت" کی یہ تصویر و تمثیل دورِ نبوت اور آغاز دعوت اسلام میں سرے سے ناپید کیوں ہے؟ آغاز دعوت اسلام میں ابو بکرؓ و ابو جہل دو الگ الگ

شخصیتیں تھیں جو روزِ اول سے روزِ آخر تک بالکل الگ ہی رہی ہیں لیکن تحریک مودودیت میں تو ایک ہی شخصیت روزِ اول تو ابوبکرؓ بنی اور وہی شخصیت آخر کو ابوجہل بھی بن گئی یہ کیا قصہ ہے ؟

ایک دوسرا اقتباس بھی

"مقدمہ تفہیم" کے مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں "منصب رسالت" کی خصوصیت و امتیازی شان جس طرح مجروح ہوتی ہے اور نبی و رسول کے حق میں تربیت خداوندی اور نصرت الٰہی سے علامہ کی چشم پوشی کھلی آنکھوں نظر آتی ہے اسکی تائید علامہ کی ایک دوسری تحریر سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے اپنی مشہور و بدنام تصنیف "تجدید و احیائے دین" میں سپردِ قلم فرمائی ہے فرماتے ہیں :-

" عقیدۂ ظہورِ مہدی کے متعلق لوگوں کے تصورات ـــــــ کچھ اس قسم کے ہیں مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھکو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے ۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید طرز کا لیڈر ہوگا ۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اسکو مجتہدانہ بصیرت ہوگی ۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا ـــــــ مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے ـــــــ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کریگا بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی ہونے کی خبر نہ ہوگی

اور اسکی موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جسکی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو یہ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے مہدیت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں ہے کر کے دکھانے کی چیز ہے اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں ـــــ مجھے اسکے کام میں خوارق، کشف و الہامات اور چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی میں یہ سمجھتا ہوں کہ انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جد و جہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے انھیں مرحلوں سے مہدی کو بھی گزرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب فکر (SCHOOL OF THOUGHT) پیدا کرے گا ذہنیتوں کو بدلے گا۔ ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اسکو کچلنے کی کوشش کرے گی مگر بالآخر وہ جاہل اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کریگا جسمیں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اوج کمال پر پہنچ

جائیگی (" تجدید احیائے دین" بحوالہ "جماعت اسلامی کا رشیش محل")

دونوں جگہ علامہ کے تیور ایک ہی نظر آرہے ہیں

"مقدمہ تفہیم" میں جو تصویر علامہ نے " داعی الی اللہ" کی کھینچی ہے اور جس طرح ہدایات قرآنی پر عمل پیرا ہونے والے ہر انسان کیلئے اسکی گنجائش رکھی ہے کہ وہ جب چاہے اپنی دعوت کے ذریعہ دور اسلام کی وہ تاریخ دہرا سکتا ہے جو نزول قرآن کے وقت خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر گذری تھی ۔ اس اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ نے حضرت مہدی علیہ الرحمہ کی بلکی وہی تصویر کھینچی ہے بلکہ دستگیری رب اور تربیت حق کے در پردہ انکار کی جو بات مقدمہ تفہیم میں اشارۃ النص اور اقتضاء النص کے طور پر ارشاد فرمائی گئی تھی وہ تجدید و احیائے دین میں حضرت مہدی کا ذکر فرماتے ہوئے صاف و صریح طور پر عبارۃ النص کے طور پر فرما دی گئی کہ:۔

" مجھے اس کام میں کرامات و خوارق، کشف و الہامات اور چلوں اور مجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی"

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات

تجدید و احیائے دین میں حضرت مہدی سے متعلق علامہ کے ارشادات مدتوں سے موضوع بحث اور معرکہ آرا بنے رہے علامہ کے بعض متاثرین اسکی وجہ سے انکار مہدی کیطرف مائل ہونے لگے اور بہت سے ناقدین نے ان عبارات کے بین السطور

یہ پڑھا کہ علامہ در پردہ مہدی بننے کا خواب دیکھنے میں مبتلا ہیں اور اب اعلان کیا ہی چاہتے ہیں بلکہ بعض بزرگوں نے تو اس قسم کی بات بھی فرمادی کہ لوگوں نے اعتراض کرکے اور شور و غوغا کرکے علامہ کو چوکنا کردیا ورنہ وہ بالکل ہی تیار ہوگئے تھے کہ "مہدویت" کا اعلان فرمادیں لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ علامہ اپنے سے پیشرو دو علاموں کا حشر دیکھ چکے ہیں ایک علامہ قادیانی دوسرے علامہ مشرقی اسلئے اب وہ اس غلطی کو ہرگز نہ دہرائیں گے وہ خود نہ کوئی دعوی کریں گے نہ اعلان انھیں جو کچھ کرنا تھا وہ کرچکے اب اس قسم کے اعلان کا کام ان کی امت ہی کو کرنا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں پوری صفائی پیش بندی اور منصوبہ بندی اپنے اسی مضمون میں پہلے ہی فرما چکے ہیں جس کا طول طویل اقتباس نقل بھی ہوچکا ہے چند فقرے مکرر ملاحظہ ہوں:۔

> "مجھے اندیشہ ہے کہ اسکی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے ـــــ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا ـــــ اسکی موت کے بعد اسکے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا"

ظاہر ہے کہ دوسروں کی جانب سے اس قسم کے اعلان کا ذمہ دار موصوف کو قرار دینا یقیناً غیر معقول ہی ہوگا موصوف نے تو "بقید ہوش و حواس" اپنے آپکو دعوی کی تہمت سے بچائے رکھنے کی کوشش فرمائی ہے کہ:۔

"مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں کرکے دکھانے کی چیز ہے"
کرنے والے نے تو اپنا کام کرکے دکھا دیا اب جسے جو دعویٰ کرنا ہو کرتا رہے
موصوف نے تو اپنے آپ کو صاف بچا لیا ہے۔

ابتدائی ہدایات کا دوسرا نمبر، ابہام در ابہام

دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں جو تین ہدایات علامہ نے متعین فرمائی ہیں
ان کے پہلے نمبر پر کلام سطور بالا میں بڑی تفصیل سے ہو چکا ہے اب ان ابتدائی
ہدایات کا دوسرا نمبر بھی ملاحظہ ہو :-

(۲) "حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت
کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں
میں پائی جاتی تھیں جنکی وجہ سے انکار رو بہ غلط ہو رہا تھا" (مقدمہ ص۲۱)

عربی کے قدیم مدارس میں درسیات کی بعض پرانی مشہور کتابوں (مثلاً
کنز، کافیہ اور سلم العلوم و مسلم الثبوت وغیرہ) کی ایجاز نویسی اور چیستاں نگاری تو
ان مدارس میں مشہور ہے مگر یہ انکشاف ناظرین کیلئے شاید بالکل ہی نیا اور ناقابل
یقین ہوگا کہ علامہ مودودی جیسا فاضل اکمل اور ہر فن مولیٰ رئیس التحریر و امیر الصحافت
شخص بھی ایسی چیستانی تحریر پر قادر ہے۔ موصوف کی عبارت کو بار بار پڑھیئے اور پوری
کوشش کیجئے کہ موصوف کا سر رشتہ مضمون ہاتھ لگ جائے آپ اپنی اس کوشش میں شاید ہی کامیاب ہوسکیں

آگہی دامِ شنیدن لاکھ گو چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے "اُسکے" عالم تقریر کا

عبارت مندرجہ بالا کا ایسا صاف اور واضح مفہوم جسے ہر ناظر آسانی سمجھ لے متعین نہیں ہوتا کہ آخر علامہ اس موقع پر کیا کہنا چاہتے ہیں ؟ کیونکہ اہل علم اور اصحاب مدرسہ تو جانتے ہی ہیں کہ " حقیقت نفس الامری " کوئی مفہوم حقیقی تو ہے نہیں بلکہ ایک مفہوم اضافی ہے ۔ ہر شے کی " حقیقت نفس الامری " علٰحدہ علحدہ ہوسکتی ہے اور ہوتی ہی ہے ۔ لہٰذا یہ پتہ کیسے چلے کہ نزول قرآن اور دعوت اسلام کے پہلے مرحلہ میں کس چیز کی " حقیقت نفس الامری " سے متعلق معلومات حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہم پہونچائی گئی تھیں ؟ علامہ کی اس تحریر مندرجہ بالا سے اس امر کی وضاحت وتعیین بالکل ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی علامہ نے از راہ بے نیازی کسی مثال کے ذریعہ اسکی تفہیم وتشریح ضروری ہی سمجھی اور ضروری بھی کیوں سمجھتے انھیں " تفہیم قرآن " مقصود ہی کب ہے ؟ جو مقصود ہے وہ حاصل ہو ہی رہا ہے ۔

الغرض علامہ کی مندرجہ بالا عبارت کو دیکھکر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ عبارت مصنف تفہیم علامہ مودودی کی ہے یا کسی اناڑی نے صدرا و شمس بازغہ یا سلم العلوم اور مسلم الثبوت کی کسی عبارت کا صرف لفظی ترجمہ کرکے چھوڑ دیا ہے ۔ اس میں مطلب ڈالنا ابھی باقی ہے فانتظروا انی معکم من المنتظرین ۔

ابتدائی ہدایات کا تیسرا نمبر

موصوف نے اس نمبر میں ارشاد فرمایا ہے :-

" صحیح رویہ کی طرف دعوت در ہدایت الٰہی کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جنکی پیروی میں انسان کیلئے فلاح وسعادت ہو (ص ۲۱)

اس نمبر میں علامہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر کسی حد تک تبصرہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔ مزید ایک بات یہاں یہ کہنی ہے کہ غور کرنے سے حقیقت یہی سمجھ میں آتی ہے کہ علامہ کے نزدیک عقائد اور عبادات کی کوئی اہمیت ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فہم قرآن کیلئے راہیں کھولنے کی کوشش میں عقائد وعبادات پر مطلق روشنی نہیں ڈالتے۔

اس موقع پر شاید کوئی صاحب علامہ کی وکالت میں یہ فرمانا چاہیں کہ موصوف قرآن مجید کی ابتدائی ہدایات ہی تو بیان فرما رہے ہیں اس وقت تک عقائد وعبادات سے متعلق ہدایات شاید نازل ہی نہ ہوئی ہوں تو انکا ذکر کیسے کر دیا جائے لیکن جیسا کہ راقم السطور گذشتہ صفحات میں ابتدائی پانچ سورتوں کی ابتدائی تعلیمات کا ایک سرسری خاکہ پیش کر کے واضح کر دیا ہے کہ ان ابتدائی تعلیمات و ہدایات میں عقائد وعبادت کی کھلی تعلیم و تلقین موجود ہے لیکن علامہ نے چونکہ اپنے نزدیک ان سے صرف نظر فرمانے اور چشم پوشی ہی کرنے کا فیصلہ فرما رکھا ہے اسلئے انکیں اگر دعوت اسلام کے ابتدائی مرحلہ میں عقائد وعبادات کی تعلیم نظر نہ آسکی تو کوئی محل تعجب نہیں ہے۔ موصوف تو دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے مشن کو بھی اسی طرح تعبیر فرما چکے ہیں، ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

"اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کیلئے انبیاء علیہم السلام پے در پے بھیجے گئے تھے (تجدید احیاء دین ص۲۱)

قرآنی اسلوب

علامہ مودودی نے اپنے مقدمہ تفہیم میں "قرآن فہمی" کی رکاوٹوں کا جائزہ

لیتے ہوئے یہ بحث بھی چھیڑی ہے کہ قرآن کا اسلوب بیان تحریری نہیں تقریری ہے اور چونکہ سابق مترجمین و مفسرین اس حقیقت تک نہیں پہونچ سکے اسلئے وہ حضرات اپنے تراجم میں نہ تو ہر دو اسلوبوں کا باہمی فرق ہی ملحوظ رکھ سکے اور نہ اسکے تقریری اسلوب کو تحریری اسلوب میں تبدیل ہی کر سکے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے تراجم میں صلاحیت تفہیم پیدا ہی نہیں ہوئی اور بدرجہ مجبوری عوام کی تشنگی بجھانے کیلئے "تفہیم القرآن" کے ذریعہ قرآن مجید کی ترجمانی کرنی پڑی۔

موصوف نے یہ بحث اپنے تفسیری دیباچہ میں بھی چھیڑی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس موضوع پر دیباچہ ہی میں زیادہ تفصیلی طور پر گفتگو فرمائی ہے اس لئے ہم بھی اس موقع پر پہلے دیباچہ ہی کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو:-

"یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا بلکہ "دعوت اسلامی" کے سلسلے میں حسب موقع و ضرورت "ایک تقریر" نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیجاتی تھی اور آپ اسے "خطبہ" کی شکل میں لوگوں کو سنا دیتے تھے

(دیباچہ تفہیم ص۲۸)

دلچسپ خوش فہمی اور دلفریب مغالطہ

علامہ کی بظاہر "سادہ اور معصوم" سی اس عبارت پر یہ سرخی اور یہ ریمارک شاید آپ کو برمحل نظر آئے اس لئے میں آپ کی توجہ مقدمۂ تفہیم کے آغاز میں آئے ہوئے علامہ کے اسی درج ذیل کیطرف مبذول کرنا چاہوں گا جہاں موصوف کو

اپنے ناظرین سے یا تو ایسی بدگمانی تھی کہ انھوں نے بڑی آسانی سے یہ فرض فرما لیا تھا کہ کہیں انکے ناظرین "مقدمہ" کا صرف عنوان ہی دیکھکر اسے قرآن کا مقدمہ نہ سمجھ لیں اور یا وہی علامہ اس موقع پر اپنے انھیں ناظرین سے یہ خوش فہمی بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ناظرین کو اپنی ہی جیسی علمی سطح پر دیکھ رہے اور یہ خیال فرما رہے ہیں کہ اسلوب قرآنی سے متعلق انکے نظریہ کی جو بنیاد ہے وہ انکی ہی طرح دوسرے تمام ناظرین کو بھی معلوم ہی ہے۔ دیکھئے نا موصوف کس سادگی سے ارشاد فرما رہے ہیں "یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شایع نہیں کیا گیا تھا" داد دیجئے موصوف کی اس صحافت کو کس اچھوتے انداز میں اسلوب قرآنی کا تقریری ہونا اور تحریری نہ ہونا ثابت فرما دیا ہے۔ ع

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را

علامہ کی یہ صحافتی چابکدستی نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن مجید جو ابتداءً رسالوں کی شکل میں محض اس وجہ سے شایع نہیں ہو سکا تھا کہ اس دور میں کتابت و اشاعت کے ذرائع و اسباب اور سہولتیں موجود ہی نہ تھیں اس تمدنی بے سامانی اور قلت اسباب و وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علامہ اسے کیا رنگ دیکر پیش فرما رہے ہیں اور اس دور کی علمی بے سروسامانی کی بنیاد پر کس طرح ایک غیر معقول اور خلاف عقل نظریہ کو جنم دے رہے ہیں۔

راقم السطور کو کہنا یہ ہے کہ علامہ کے نزدیک کسی معقول اور تاریخی ثبوت

کی بنیاد پر یا بغیر ثبوت ہی سہی (کہ موصوف تو شاید اپنے آپ کو ہم لوگوں کی طرح کسی نقل وحوالہ یا دلیل وثبوت کا محتاج نہیں سمجھتے) بالفرض یہ بات طے تھی کہ قرآن مجید کا طرز تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے تو شوق سے اسکا اظہار فرماتے اور پھر اس بنیاد پر کچھ فرمانا چاہتے تو وہ بھی فرما دیتے لیکن یہ موصوف کی صریح جسارت اور زبردستی ہے کہ وہ محض قرآن مجید کے رسالوں کی شکل میں ابتداءً شایع نہ ہوسکنے ہی کو اسلوب قرآنی کے تقریری ہونے کی بنیاد قرار دیکر اس پر اپنی تحقیق انیق "کا شیش محل" تعمیر فرما ڈالیں اور جب اس پر تبصرہ کیا جائے تو شیش محل کے تماشائی موصوف کے محل کے چکنا چور ہونے کی دہائی دینے لگیں۔ ع ۔ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا۔

مگر آپ کو تعجب ہوگا

علامہ مودودی قرآن مجید کے متعلق اس کے تقریری ہونے کا جو انکشاف فرما رہے ہیں اور اپنے ناظرین کو بھی اپنی سطح پر سمجھتے ہوئے اس انکشاف سے واقف وباخبر قرار دے رہے ہیں وہ انکشاف عام لوگوں کو تو کیا ہوتا استاد علمائے ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ بھی شاید اس انکشاف سے باخبر نہ تھے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب موصوف اصول تفسیر کی اپنی مشہور کتاب الفوز الکبیر میں تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو الفوز الکبیر ص۳۴ تا ص۴۲ ذیل میں ہم ازراہ اختصار صرف مطلب نیز ترجمہ ہی پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"تیسرا باب قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق ہے جسے ہم تین فصلوں میں بیان کرتے ہیں:۔

پہلی فصل، "قرآن مجید ابواب وفصول پر منقسم نہیں ہے کہ ہر مسئلہ کو کسی متعین باب یا فصل میں تلاش کیا جائے بلکہ تفہیم حقیقت کے لئے بطور فرض مثالاً یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن مجید شاہی فرامین و مکاتیب کا مجموعہ ہے، جس طرح شاہان جہاں حسب موقع و ضرورت اپنی رعایا کیلئے شاہی فرامین جاری فرماتے ہیں کسی موقع پر کوئی فرمان اور کسی دوسرے موقع پر کوئی دوسرا فرمان تحریر فرماتے ہیں اور اسی طرح جب بہت سے فرامین اور مکاتیب جمع ہو جاتے ہیں تو کوئی شخص انھیں مدون و مرتب کر کے باقاعدہ ایک مرتب مجموعہ تیار کر دیتا ہے ____ بالکل اسی طرح شہنشاہ مطلق خداوند عالم نے اپنے بندوں کی ہدایت کیلئے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حسب موقع و ضرورت (جسکا علم خداوند تعالیٰ کو پہلے ہی سے تھا) یکے بعد دیگرے ایک سورۃ پھر دوسری سورۃ نازل فرمائی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک تمام سورتیں علحدہ علحدہ ہی محفوظ رہیں انھیں ایک "مجلد" میں یکجا نہیں کیا گیا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانہ میں اس ترتیب خاص کے ساتھ یکجا مجلد کیا گیا۔ (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں) چونکہ ان سورتوں کے اسلوب بیان اور شاہی فرامین کے اسلوب بیان میں پوری پوری یکسانیت تھی پائی جاتی ہے اسلئے ان سورتوں کے آغاز و اختتام میں بھی انھیں "شاہی فرامین" کا انداز ملحوظ رکھا گیا ہے" (الفوز الکبیر ص۳۴)

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے قرآن مجید کی مختلف و متعدد سورتوں کی ابتدائی و آخری آیات کو بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے شاہی فرامین سے انکی یکسانیت و مطابقت ظاہر فرمائی ہے جسے انشاء اللہ تعالیٰ ہم بھی آئندہ قریب ہی نقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

فی الحال ہم یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موضوع سے متعلق علامہ کے کچھ ارشادات اور پیش کر دیے جائیں کہ ہمارے ناظرین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ موصوف کو اپنی اس رائے پر کتنا اصرار ہے۔ اسی "دیباچہ تفہیم" کے ص ۹ پر تحریر فرماتے ہیں

(الف) "علاوہ بریں جیسا کہ میں ابھی اشارۃً عرض کر چکا ہوں (اشارہ کو شاید ناکافی سمجھتے ہوئے اب صراحتاً فرمانا چاہتے ہیں) قرآن مجید کی ہر سورۃ دراصل ایک تقریر تھی جو دعوت اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقع پر نازل ہوئی تھی" (دیباچہ ص ۹)

(ب) "اس طویل اور شدید کشمکش کے دوران اللہ تعالیٰ حسب موقع اور حسب ضرورت اپنے نبیؐ پر ایسے "پر جوش خطبے" نازل کرتا رہا جنہیں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی (مقدمہ تفہیم ص ۲۳)

صرف دعویٰ ہی دعویٰ

علامہ کو خدا جانے کیسے یہ گمان پیدا ہو گیا ہے کہ جو کچھ جی میں آئے وہ بے جھجک

Scanned with CamScanner

فرماتے چلے جائیں ان کے کسی دعوی پر کوئی دلیل و برہان طلب کرنیوالا نہیں ہے سب جیسے کسی نے ان سے کہہ دیا ہو۔ ع: آپ جو کہتے ہیں علامہ بجا کہتے ہیں۔

اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی تفہیم القرآن اور اسکے دیباچہ و مقدمہ میں بھی جگہ جگہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ کرتے چلے جاتے ہیں اپنے کسی دعویٰ کی دلیل اور اپنی کسی بات کی مثال پیش کرنے کی ضرورت وہ بالکل نہیں محسوس فرماتے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اس قسم کی علمی وصحافتی پابندیوں کو اپنے مقام تحقیق کے خلاف اور اپنے مرتبۂ بلند سے فروتر سمجھتے ہوں۔

موصوف کو چاہیئے تھا کہ اسلوب قرآنی سے متعلق جب وہ یا چونکا دینے والا دعویٰ اور انکشاف فرماتے تو اسکی کچھ مثالیں بھی دیدیتے تاکہ جس سے ان کے دعویٰ میں کچھ تو استحکام پیدا ہو جاتا اور انکی یہ بات کسی درجہ بھی تو قابل تسلیم ہو جاتی۔ اب اگر کوئی شخص دیباچۂ تفہیم کی عبارت منقولۂ بالا (شق الف) کو دیکھکر موصوف کے اس دعوی کو کہ "قرآن مجید کی ہر سورت ایک تقریر تھی" کسی مثال و دلیل کے ذریعہ ثابت و مستحکم دیکھنا چاہے اور اصل کیفیت نزول اور ترتیب نزول کے مطابق اس دعویٰ کی واقعیت کو پرکھنا چاہے تو ہمیں مطلق یقین نہیں کہ ہمارے علامہ اپنے اس دعویٰ کو میزان حقیقت پر پورا اتار سکیں گے اور کسی بھی طرح یہ خلاف حقیقت بات ثابت کر سکیں گے کہ قرآن مجید کی ہر سورۃ دراصل ایک تقریر تھی۔

ایسی صورت میں جبکہ موصوف کا یہ انکشاف صرف انکی ذہنی دنیالی اپج اور یہ دعوی صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو تو کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ علامہ مودودی اپنے مطالعۂ قرآن اور تعمق مطالعہ کی جتنی نمائش فرماتے ہیں اصل حقیقت اتنی نہیں ہے

یہ تضاد بیانی ملاحظہ

علامہ موصوف جو اپنے دیباچہ و مقدمہ میں اشارتاً و صراحتاً یہ دعویٰ فرما چکے تھے کہ "قرآن مجید کی ہر سورت ایک تقریر تھی" آگے چل کر اپنی تفسیر تفہیم میں اپنا سارا منصوبہ و دعویٰ فراموش فرما جاتے ہیں چنانچہ ہم علامہ کی اسی تفہیم سے چند اقتباسات ایسے بھی پیش کرنے جا رہے ہیں جس میں علامہ اپنے سابق دعویٰ کے برخلاف یہ ارشاد فرماتے نظر آرہے ہیں کہ فلاں فلاں سورتیں مختلف اوقات کی متعدد تقریروں پر مشتمل ہیں گویا موصوف ہر سورہ کے ایک تقریر ہونے کے دعویٰ سے خود ہی دستبردار ہو گئے ہیں یہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(مثال ۱) سورۂ بقرہ کے زمانۂ نزول سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں)

"اس سورۃ کا بیشتر حصہ ہجرت مدینہ کے بعد مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا اور کمتر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبت مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا، حتیٰ کہ سود کی ممانعت کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں حالانکہ وہ (آیات ربوا) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ میں اتری تھیں۔ سورۃ کا خاتمہ جن آیات پر ہے وہ ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں مگر مضمون کی مناسبت سے انکو بھی اسی سورہ میں ضم کر دیا گیا ہے۔" (تفہیم جلد اول ص۴٦)

(مثال ۲) سورۂ آلِ عمران کے نزول اور اجزائے مضمون پر روشنی

ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں) :-

" اس میں چار تقریریں شامل ہیں (۱) پہلی تقریر آغاز سورت سے چوتھے رکوع کی ابتدائی آیتوں تک ہے (۲) دوسری تقریر آیۃ ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحًا (الایہ) سے شروع ہوتی ہے اور چھٹے رکوع کے اختتام پر ختم ہوتی ہے یہ ۹ھ میں وفد نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی (۳) تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لیکر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اسکا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے (۴) چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختم سورۃ تک جنگ احد کے بعد نازل ہوئی"

(تفہیم ص ۲۲۸ جلد اول)

(مثال ۳) سورۂ نساء کا زمانۂ نزول اور مضمون بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں) :-

" یہ سورت متعدد خطبوں پر مشتمل ہے جو غالبًا ۳ھ کے اواخر سے لیکر ۴ھ کے اواخر یا ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہیں اگرچہ یہ تعیین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی تھیں اور انکا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے؟" (تفہیم جلد اول ص ۳۱۶)

(مثال ۴) سورہ توبہ کے زمانۂ نزول اور اجزائے سورۃ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں) :-

" یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے - پہلی تقریر آغاز سورہ سے
سے پانچویں رکوع کے آخر تک چلتی ہے۔ دوسری تقریر رکوع ۶
کی ابتدا سے رکوع ۹ کے اختتام تک چلتی ہے ، تیسری تقریر رکوع ۱۰
سے شروع ہو کر سورت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے ۔
اس میں متعدد ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو انھیں ایام میں مختلف
مواقع پر اترے اور بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد الہٰی سے
ان سب کو یکجا کر کے ایک سلسلہ تقریر میں منسلک کر دیا مگر چونکہ وہ
ایک ہی مضمون اور ایک ہی سلسلہ واقعات سے متعلق ہیں اسلئے ربط تقریر
میں کہیں خلل نہیں پایا جاتا " (تفہیم جلد ۲)

مندرجہ بالا چار مثالیں تفہیم القرآن کی پہلی دو جلدوں ہی سے پیش کر دی گیئں ہیں ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ ہر سورت کو ایک تقریر ارشاد فرمانے والے علامہ نے آغاز دعوت اور ترتیب نزول قرآن کا جو منصوبہ صرف اپنے دماغ کے بل بوتے پر تیار فرمایا تھا حقائق و واقعات کے عالم میں وہ کس طرح بے حقیقت ثابت ہوا اور موصوف کو دبی زبان میں اپنے سابق موقف کو چھوڑ دینے ہی میں عافیت نظر آئی اور کیسی خاموشی کے ساتھ موصوف نے مندرجہ بالا سورتوں کو ایک ایک تقریر کی بجائے " متعدد تقریروں " کا مجموعہ تسلیم فرمالیا۔

(مثال عـ۵) (اب تفہیم کی پہلی جلد سے ایک مثال ایسی بھی ملاحظہ فرمائیے
جسمیں موصوف سورۂ مائدہ (جو پورے ایک پارہ کی سورت) سے متعلق
ایک تقریر ہونے کا دعویٰ تو فرماتے ہیں مگر ساتھ ساتھ یہ امکان بھی تسلیم
فرمالیتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ سورہ "پورا ایک خطبہ" نہ ہو - فرماتے ہیں) :-

"بیان کے تسلسل سے غالب گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورہ ایک ہی خطبہ ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اسکی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے انکو اس سورت میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے"

(تفہیم القرآن جلد اول ص۴۳۴)

یہ سیماب وشی کیسی؟

ناظرین کرام علامہ مودودی کے وہ ارشادات یقیناً ابھی بھولے نہ ہوں گے جو موصوف نے قرآن مجید کی "تصنیفی ترتیب" اور "کتابی اسلوب" وغیرہ سے متعلق فرمائے تھے اور کس ہمت و جسارت کے ساتھ اسے غیر مربوط اور غیر مرتب کلام اور مختلف شذرات کا مجموعہ بھی قرار دے چکے تھے اور اب ان مندرجہ بالا ارشادات میں جبکہ قرآن مجید کی ہر سورہ کو "ایک تقریر" کہنے کا مرحلہ پیش آگیا تو کس صفائی اور سینہ زوری کے ساتھ سورۂ مائدہ کو دو تین خطبوں اور تقریروں کا مجموعہ مانتے ہوئے بھی اس میں کسی قسم کے خلا اور جھول کا وجود بھی ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے

پائے استدلالیاں چوبیں بود

حضرت مولانا روم علیہ الرحمہ نے کیسی عمدہ بات اس شعر میں بیان فرمائی ہے

Scanned with CamScanner

کو منقولی حضرات کی ٹانگیں چوبیں (لکڑی کی) ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ لکڑی کے پاؤں ثبات اور جماؤ نہیں رکھتے۔ حضرت مولانا رومؒ کی بیان فرمودہ یہ حقیقت علامہ کی تفہیم میں بار بار مشاہدہ میں آتی ہے

اوپر دی ہوئی پانچ مثالوں میں سے مثال ۴ میں خط کشیدہ فقروں پر غور فرمائیے علامہ کے ارشادات کے آس پاس بھی اس حقیقت کا سایہ بھی آپ کو نظر نہ آسکے گا کہ اصل قرآن مجید ازل سے ہی اپنی اسی موجودہ ترتیب و شکل میں لوح محفوظ میں مکتوب تھا، اللہ تعالیٰ کو آیات قرآنی اچانک بغیر کسی منصوبے کے نازل نہیں کرنی پڑ گئی تھیں کہ ان میں سلسلۂ مضامین یا ربط آیات کے خلل پذیر ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکے لیکن علامہ کے ارشادات کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ "ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اسکی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے انکو اس سورۃ میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو لیکن سلسلۂ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ یہ سورہ دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے" — گویا علامہ "خلا" اور "بے ربطی" کی نفی صرف اتفاقی طور پر تسلیم فرما رہے ہیں اسمیں ارادۂ الٰہی کا دخل مطلق نہیں ہے۔

مجھے احساس ہے کہ

ابھی تو مقدمۂ تفہیم ہی زیر تبصرہ ہے اس موقع پر علامہ کی اصل تفہیم القرآن پر تبصرہ اور اسکے اغلاط پر کوئی کلام قبل از وقت ہو جائے گا اس لئے اصل تفہیم پر تبصرہ کو سر دست ملتوی کرتے ہوئے پھر علامہ کے مقدمہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ابھی چند صفحات پہلے علامہ کی چھڑی ہوئی ایک نئی بحث اسلوب قرآنی سے متعلق چل رہی تھی اور راقم السطور نے اسی سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے رسالہ "الفوز الکبیر" سے کچھ تحقیقات بھی نقل کر دی تھیں اور یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اس بحث کی مزید تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کیجائیگی، اسلئے حسب وعدہ وہی تفصیلات پیش کیجا رہی ہیں

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں

"چونکہ قرآنی سورتوں کے اسلوب اور شاہی فرامین کے انداز و اسلوب میں پوری پوری مناسبت و یکسانیت پائی جاتی ہے اسی وجہ سے قرآنی سورتوں کی ابتداء وانتہاء میں بھی شاہی فرمانوں کی ابتدا وانتہاء کا وہی انداز پایا جاتا ہے۔

چنانچہ جس طرح سے بعض مکاتیب گرامی اور فرامین شاہی خدا کی حمد و ثنا سے شروع ہوتے ہیں اور بعض فرامین و مکاتیب میں غرض نگارش و تحریر سے ابتدا کیجاتی ہے اور بعض مکاتیب میں مرسل و مرسل الیہ (کاتب و مکتوب الیہ) کے نام شروع میں لائے جاتے ہیں، پھر بعض تحریریں مختصر سے رقعہ کی شکل میں ہوتی ہیں جن میں کوئی سرنامہ وعنوان وغیرہ بھی نہیں ہوتا اور بعض مکاتیب طولانی اور بعض دوسرے مختصر ہی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح قرآنی سورتوں میں سے بعض کو حمد وتسبیح کے مضمون سے شروع فرمایا ہے اور بعض سورتوں کو غرض نگارش و تحریر بیان فرماتے ہوئے شروع فرمایا ہے مثلاً ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۝ یا سُوْرَةٌ أَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا (نور) ان سورتوں میں وہی انداز تحریر اختیار کیا گیا ہے جو کسی سرخط اور دستاویز یا کسی معاہدہ نامہ میں اختیار

کیا جاتا ہے اور خود حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صلح حدیبیہ کے موقع پر جو معاہدہ نامہ املا کرایا تھا اسکی ابتدا بھی اسی متعارف انداز میں کی گئی تھی۔ یعنی هٰذا ما قاضٰی علیہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض سورتیں مرسل و مرسل الیہ کے ذکر سے شروع فرمائی ہیں مثلاً تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ان سورتوں کا یہ انداز اس قسم کے شاہی فرامین و احکام سے مشابہت رکھتا ہے جن میں کوئی حکم جاری کرتے ہوئے آغاز حکم میں یوں لکھا جاتا ہے کہ "دربار خلافت سے فرمان جاری کیا جاتا ہے" یا اس طرح کہ "فلاں شہر کے باشندوں کو دربار خلافت سے آگاہی دی جاتی ہے (خبردار کیا جاتا ہے) اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد سلاطین کو دعوت اسلام کے سلسلے میں جو والا نامے روانہ فرمائے تھے وہ بھی اسی اسلوب ہی کے مطابق تھے۔ مثلاً من محمد رسول اللہ الی هرقل عظیم الروم (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے روم کی عظیم شخصیت ہرقل کے نام)۔

اور قرآن مجید کی بعض سورتوں میں رقعات شقات کا انداز اختیار فرماتے ہوئے بغیر سرنامہ و عنوان براہ راست اصل مضمون ہی سے سورہ شروع کر دی گئی ہے مثلاً قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا (سورہ حشر) ۔ یا اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ (سورہ منافقون)

حضرت شاہ صاحب مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ چونکہ اہل عرب کے نزدیک انکے قصائد خصوصی طور پر شہرت رکھتے تھے اور قصیدوں میں تشبیب کا ذکر بھی متعارف

وستعمل تھا اور تشبیب کے مضامین میں ایسے مضامین بھی داخل تھے جو ہولناک واقعات یا عجیب مقامات کے ذکر پر مشتمل ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بعض قرآنی سورتوں میں اس اسلوب کو بھی اختیار فرمایا ہے مثلاً وَالصَّافَّاتِ صَفًّا فَالزَّاجِرَاتِ زَجْرًا وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا فَالْحَامِلَاتِ وِقْرًا وغیرہ "۔ (الفوز الکبیر ص ۳۵)

ببیں تفاوتِ رہ

کچھ اوپر ہم نے ایک ذیلی سرخی "صرف دعویٰ ہی دعویٰ" قائم کی تھی جسکے تحت علامہ کی یہ کمزوری ظاہر کی تھی کہ موصوف دعویٰ تو بڑے سے بڑا کر جاتے ہیں مگر کسی مثال و دلیل کے ذریعہ اسے سمجھانے اور ثابت کرنے کی ضرورت مطلق نہیں سمجھتے لیکن جیسا کہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ موصوف کے اس طرز عمل کے بالکل برخلاف حضرت شاہ علیہ الرحمہ کی مندرجہ بالا تحقیق جو آپ کے سامنے پیش کردی گئی اس میں حضرت شاہ صاحب نے قرآن مجید کے اسلوب سے متعلق جو دعویٰ کیا ہے تو آخر تک کس لطف و خوبی سے مثالوں کے ذریعہ سمجھاتے اور ہر دو اسلوبوں کے مابین مناسبت و مطابقت اور یکرنگی و یکسانیت بھی ثابت فرماتے چلے گئے ہیں کہ ہر ناظر اس بحث سے پوری طرح لطف اندوز و مطمئن بھی ہو جائے۔ لیکن علامہ موصوف ہیں کہ وہ اس قسم کی تصنیفی و صحافتی ذمہ داری سے شاید ایسے بالاتر ہیں کہ موصوف کو اپنی اس کمزوری کا مطلق احساس تک نہیں ہے یا شاید جذبۂ انکار اسلاف و اکابر اور شوق اجتہاد نے موصوف کے ذہن میں کچھ اس قسم کا زعم و پندار پیدا فرما دیا ہے جسے ایک عربی شاعر نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے ؎

Scanned with CamScanner

وَ نُذَكِّرَانْ بِشِئْنَا عَلَى النَّاسِ فَوْقَهُمْ
وَلَا يُذَكِّرُوْنَ الْقَوْلَ حِيْنَ نَقُوْلُ

(۵ہم جو چاہیں تو کریں شوق سے اپنی تنقید یہ مجال انکی نہیں ہم پہ وہ تنقید کریں)

علامہ سے یہ بات تو کہی جا سکتی ہے

حضرت! چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ "ہر سورہ دراصل ایک تقریر تھی جو دعوت اسلامی کے کسی خاص مرحلہ میں ایک موقع پر نازل ہوئی تھی" حالانکہ آپ ہی کے تحریری اقرار سے ہم یہ بات ثابت کر آئے ہیں کہ سورہ سے متعلق "ایک تقریر" ہونے کے دعوی پر تو خود آپ بھی زیادہ دیر تک قائل و قائم نہیں رہ سکے ہیں۔ لیکن جہاں تک قرآنی سورتوں کے تقریر ماننے کی بات ہے تو شاید اس پر آپ کو اصرار ضرور ہے۔ تو براہ کرم ذرا یہ تو ارشاد فرمایا جائے کہ اگر کوئی شخص آپ کے اس دعوی کو "میزان حقیقت" میں رکھکر مندرجہ ذیل سورتوں میں انداز تقریر و خطابت تلاش کرتے کرتے حیران ہو جائے اور اپنا اطمینان چاہے تو آپ کس طرح ان سورتوں کو تقریر کے قالب میں ڈھال سکیں گے ہم نے آپکی صلاحیت تحریر تو دیکھ لی کہ آپ نے تمام مترجمین کے برخلاف یہ حقیقت دریافت فرمائی کہ قرآن مجید کی سورتیں دراصل تقریر و خطبہ کا انداز رکھتی ہیں اس لئے ترجمہ کرتے وقت اگر تقریری اسلوب کو تحریری اسلوب میں صحیح طور پر منتقل نہ کیا جائے گا تو قرآن مجید کی بے ربطی دور نہ ہوگی اور فہم قرآن آسان نہ ہو سکے گا۔ اب ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ جناب والا ان مندرجہ سورتوں کو ان کے اصلی رنگ تقریر و خطبہ میں بھی ذرا پیش کر کے دکھلا دیں، مثلاً

(۱) "سورۂ فاتحہ کو دعوت اسلام کے کسی مرحلہ کی تقریر کا روپ دیدیں۔ یا

(۲) " سورۂ کوثر" کو کسی طرح بھی (ایڑی سے چوٹی تک زور لگا کر ہی سہی) دعوت اسلام کے کسی مرحلہ کی تقریر ثابت فرمادیں تو ہم آپ کی قدرتِ کلام کے قائل ہوجائینگے اور اس پر غور کرنا شروع کردیں گے کہ آپ نے اپنی تفسیر اور اسکا دیباچہ و مقدمہ اپنے افکار و نظریات کی اشاعت اور ترویج کے لئے نہیں لکھا ہے لیکن یہ پتہ کی بات ہرگز نہ بھولئے گا کہ سورۂ کوثر کا خاتمہ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین پر نہیں ہوا ہے بلکہ اسکی آخری آیت اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ہے۔

(۳) "سورہ لہب" (تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ) کو کسی طرح خطبہ و تقریر کے انداز میں منتقل فرمادیجئے جبکی ابتداء ہی سراپا عتاب و سزا فقرہ سے ہو رہی ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی معمولی اور موٹی عقل کا آدمی بھی اس سراپا جلال و عتاب اور نکال و عذاب حکم سزا پر مشتمل شاہی فرمان کو تقریر و خطبہ سمجھنے کی ہمت و جسارت نہ کرسکے گا۔ البتہ وہ حضرات جو دوسروں پر "حق تنقید" خیرات کرکے اپنے کو ماورائے تنقید سمجھتے ہوئے کسی شیش محل میں محفوظ ہوگئے ہوں وہ اگر ایسی بات کہیں تو ضرور کہہ سکتے ہیں کہ انکے قطب مینار عقل و فہم تک ہم جیسوں کی تنقید کہاں پہونچ سکتی ہے۔

یہ خیال ہرگز نہ فرمایا جائے کہ

ہم نے موصوف کے دعویٰ کی حقیقت پرکھنے کیلئے ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کا انتخاب صرف اس لئے کیا ہے کہ انھیں تقریر و خطبہ کا روپ دینا واقعی دشوار ہوجائے۔ اس غلط فہمی کو بھی دور کیا جا سکتا ہے لیجئے اب ہم کچھ بڑی سورتوں کے نام بھی بطور نمونہ

پیش کرتے ہیں ذرا ان پر بھی طبع آزمائی فرما کر انھیں کو تقریر و خطبہ کے روپ میں منتقل فرما دینے کی کوشش کر دیکھئے۔ مثلاً:-

(۱) سورۂ نوح جو یوں شروع ہوتی ہے اِنَّا اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ (ہم بدولت نے نوح کو انکی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا) کیا اس سورہ کا یہ طرز آغاز کسی طرح بھی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ و تقریر کا ہو سکتا ہے؟ یقیناً نہیں ہو سکتا ہاں اگر اسے زمانۂ ماضی میں جاری شدہ کسی شاہی فرمان کی نقل و حکایت کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں اور یہ بات بالکل قرین عقل ہوگی اور حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ و تحقیق کے عین مطابق ہوگی

اسی طرح سورۂ قدر اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝ اور سورۂ علق اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ کو بھی تقریر و خطبہ ثابت کر دینا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہ ہوگا۔

(۲) وہ سورتیں جنمیں حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو شخصی و ذاتی طور پر مخاطب فرماتے ہوئے براہ راست آپ ہی کو کوئی حکم دیا گیا ہے جیسے یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ یا طٰہٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی وغیرہ میں براہ راست مخاطب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو فرمایا گیا ہے ایسی سورتوں پر "خطبہ و تقریر" کا اطلاق مضحکہ خیزی کے سوا اور کیا نتیجہ دے سکتا ہے انھیں خطبہ و تقریر وہی کہہ سکتا ہے جو تقریر کے مفہوم ہی سے بالکل نابلد ہو اور لکھے ہوئے مقالوں کا پڑھ دینا بھی اسکے نزدیک خطبہ و تقریر کا مقام رکھتا ہو۔

Scanned with CamScanner

حقیقت کا سراغ اور مغالطہ کی بنیاد

مقدمۂ تفہیم پر اپنے تبصرہ کے آغاز میں ہم نے علامہ کی روشنی طبع کو یاد کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرع بھی نقل کر دیا تھا، سچی بات یہ ہے کہ دوران تبصرہ وہ فارسی مصرعہ ہمکو بار بار یاد آتا رہا۔ ع۔ این روشنی طبع تو بر من بلا شدی - ہم نے برابر یہی محسوس کیا کہ علامہ کا جذبۂ انکارِ تقلید و اتباع اور وفورِ شوق اجتہاد انھیں اس قسم کی غیر ضروری موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں پر مجبور کرتا ہے موصوف کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انکی کسی بات پر اخذ و نقل اور اتباع و تتبع کا ذرا داغ دھبہ بھی نہ آنے پائے اور وہ جو بات بھی کہیں وہ صرف انکی اپنی " اپج " اور دماغی و خیالی "پیداوار" ہو۔ حالانکہ واقعتاً وہ ایسا کر تو نہیں سکے ہیں لیکن نمائش پوری یہی کی ہے کہ ساری تفہیم انکی طبعزاد ہے۔

اسی جذبۂ شوق نے انھیں اس مضحکہ خیز انکشاف پر آمادہ و مجبور کر دیا کہ وہ اسلوب قرآنی کی بحث میں اتنے آگے نکل جائیں کہ دوسروں کے لئے انکا تعاقب بھی مشکل ہو جائے۔

علامہ موصوف قرآن مجید کی کیفیت نزول سے بحث کرتے ہوئے بھولکر بھی وہ تعبیریں اختیار نہیں فرماتے جو عام طور پر کتب تفسیر میں مروج و متداول ہیں حضرات مفسرین بالعموم نزول آیت و سورہ کو یوں تعبیر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی یا سورہ یا یہ آیت اتری وغیرہ وغیرہ مگر علامہ یوں ارشاد فرماتے ہیں (الف) (سورۂ آل عمران) اس میں چار تقریریں شامل ہیں (ب) (سورۂ نسار) یہ سورہ

متعدد خطبوں پر مشتمل ہے (ج) (سورۂ توبہ) یہ سورہ تین تقریروں پر مشتمل ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو روحِ تقدس و نورانیت خدا اور رسول کے تجویز فرمودہ لفظ وحی وغیرہ میں ہے وہ علامہ کے خطبہ و تقریر میں کہاں سے آسکتی ہے ۔

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ علامہ کے ذہن وقّاد نے پہلے تو اسلوب قرآنی کے تقریری ہونے کا فیصلہ کیا ہوگا پھر ترقی فرماکر یہ سمجھ لیا کہ قرآن مجید کی ہر سورہ دراصل ایک تقریر ہے حالانکہ کسی اسلوب کا تقریری ہونا اور بات ہے اور سورہ کا تقریر ہونا اور بات ہے اسلئے اگر قرآن مجید کے اسلوب کو بالفرض تقریری تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی ہر سورۂ قرآنی پر خطبہ و تقریر کا اطلاق اپنے جواز کیلئے محتاج دلیل ہوگا اور بغیر دلیل یہ اطلاق نہ صحیح ہوگا نہ قابل قبول ہی کہا جائے گا ۔

اسمارِ کلام اللہ توقیفی ہیں

علمار تفسیر اسکی تصریح فرما چکے ہیں کہ مجموعۂ کلام اللہ کیلئے بھی صرف وہی نام استعمال ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اسکے لئے تجویز اور استعمال فرمائے ہیں (وہ مجموعی نام ۵۵ یا کچھ زائد ہیں جنکی تفصیل آرہی ہے ۔ اسی طرح قرآن مجید کے مختلف اجزا کے لئے بھی وہی الفاظ اور نام استعمال ہو سکتے ہیں جو ان کے لئے مقرر ہیں مثلاً سورہ کو صرف سورہ ہی کہا جائیگا اسے خطبہ و تقریر کہنا صحیح نہ ہوگا ۔ آیت کو آیت ہی کہیں گے شعر و بیت نہ کہیں گے ۔ آیت کے آخری ٹکڑے کو فاصلہ ہی کہیں گے قافیہ و ردیف سے تعبیر صحیح نہ ہوگی

اتقان میں ہے

علامہ سیوطی علیہ الرحمہ اپنی مشہور تصنیف "اتقان" میں علامہ جاحظ سے

نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (کلام اللہ) کے لئے ایسے نام مقرر فرمائے ہیں جو ان ناموں سے بالکل مختلف اور علیحدہ ہیں جنھیں اہل عرب اپنے کلام کیلئے استعمال کرتے تھے اور ناموں کا یہ اختلاف مجموعی طور پر بھی ملحوظ رہا اور تفصیلی طور پر بھی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مجموعی کلام کو قرآن کا نام دیا جب کہ اہل عرب اپنے مجموعہ کلام کو دیوان کہتے تھے۔ اسی طرح قرآن مجید کے مختلف اجزاء کو سورہ فرمایا جبکہ اہل عرب اپنے دیوان کے اجزاء کو قصیدہ کہتے تھے۔ پھر سورہ کے اجزاء کو آیت کا نام دیا جبکہ اہل عرب اپنے اجزائے قصیدہ کو بیت (شعر) کہتے تھے اور آیت کے آخری ٹکڑے کو فاصلہ کا نام دیا جسے اہل عرب اپنے قصیدہ و بیت میں قافیہ کہتے تھے (اتقان جلد اول ۱۵۱ھ)

"البرہان للناظر فی القرآن" میں ہے

اس کے بعد شیخ جلال الدین سیوطیؒ علامہ ابوالمعالی عزیزی کی کتاب البرہان سے نقل فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب (کلام اللہ) کے ۵۵ نام خود قرآن مجید میں ذکر فرمائے ہیں (علامہ سیوطی نے تو بطور حوالہ ان ناموں میں سے ہر نام سے متعلق آیت کی طرف اشارے بھی فرما دیئے ہیں مگر ہم از راہ اختصار صرف ان ناموں کے نقل ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ آیات "اتقان" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اسماء کلام الٰہی ۵۵ ہیں

"کتاب ۔مبین ۔قرآن ۔کریم ۔کلام ۔نور ۔ہدیٰ ۔رحمۃ ۔فرقان ۔شفار موعظۃ ۔ذکر ۔مبارک ۔علی ۔حکمۃ ۔حکیم ۔مہیمن ۔حبل ۔صراط مستقیم قیم ۔قول فصل ۔نبا عظیم ۔احسن الحدیث ۔متشابہ ۔مثانی ۔تنزیل روح ۔وحی ۔عربی ۔بصائر ۔بیان ۔علم ۔حق ۔ہادی ۔عجب ۔تذکرہ العروۃ الوثقیٰ ۔صدق ۔عدل ۔امر ۔منادی ۔بشریٰ ۔مجید ۔زبور ۔بشیر نذیر ۔عزیز ۔بلاغ ۔قصص ۔صحف ۔مکرمہ ۔مرفوعۃ ۔مطہرۃ ۔"

(الاتقان جلد اول ص۵۱ و ص۵۲)

خطبہ و تقریر کا کوئی ذکر نہیں

قرآن مجید میں مزید غور و تفحص اور تلاش و جستجو کے ذریعے حضرات علمار کرام نے کچھ اور بھی نام تلاش کر لئے ہیں مثلاً برہان ۔امام ۔خیر ۔مصدق بھی قرآن مجید میں مذکور ہوئے ہیں لیکن کافی تلاش کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کے ناموں میں علامہ کے تجویز فرمودہ نام یعنی خطبات و تقریر کا استعمال کہیں بھی دیکھنے سننے میں نہ آسکا نہ ہی یہ الفاظ قرآنی سورتوں کیلئے مستعمل ہوئے ہیں ۔

قابل غور بات

ابھی چند سطور پہلے علامہ سیوطی کی اتقان کے حوالہ سے علامہ جاحظ کی یہ بات نقل

کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کیلئے ایسے نام مقرر فرمائے جو ان ناموں سے بالکل مختلف اور علیحدہ ہیں جنھیں اہل عرب اپنے کلام کیلئے استعمال کرتے تھے۔

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ کلام الٰہی کے ناموں کی تجویز اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے انسانوں کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اسکے نام اپنی طرف سے مقرر کریں۔ اور دوسری بات یہ بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نام بھی ایسے مقرر فرمائے جو کلام انسانی کیلئے استعمال نہیں ہوتے تھے اسکی بنیاد پر یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ جو الفاظ کلام انسانی کیلئے استعمال ہوتے ہوں کلام الٰہی کے لئے انکا استعمال غیر صحیح اور نادرست ہی کہا جائے گا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جب خود فصحائے عرب نے بھی کلام بشر سے اسکا تفوق و امتیاز تسلیم کرتے ہوئے اسے کلام الٰہی مان لیا تو اب اسکے لئے ایسے القاب و تعبیرات کب صحیح ہونگی جو صرف کلام بشر کیلئے مستعمل ہوں۔

تاریخ مظفری میں ہے

علامہ جلال الدین سیوطی اسمائے قرآنی نقل فرمانے کے بعد اسی سیاق کلام میں تاریخ مظفری کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں:۔

"فائدہ) مظفری نے اپنی تاریخ میں یہ بات نقل کی ہے کہ "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہد میں جب قرآن مجید کو یکجا جمع کیا تو لوگوں سے (بطور طلب مشورہ) فرمایا اس کے لئے کوئی نام تجویز کرو تو بعض لوگوں نے کہا انجیل نام رکھدیا جائے مگر اس

تجویز کو بقیہ سب لوگوں نے ناپسند کیا تو کسی اور نے کہا سفر (یعنی کتاب) نام مقرر کرلیں تو چونکہ یہ لفظ کتاب یہود کیلئے مستعمل تھا اس تعلق کی بنا پر یہ نام بھی ناپسند کیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ کسی کتاب کو (غالباً آسمانی ہی کتاب ہوگی ممکن ہے انجیل ہی ہو) وہ لوگ مصحف کہتے ہیں لہٰذا سب کی پسند سے بالاتفاق یہ نام مقرر کردیا گیا (کہ خود قرآن مجید میں آیا ہوا نام بھی ہے" (الاتقان جلد اول صہ۵۳)

چند سطروں کے بعد ہی علامہ سیوطیؒ ارشاد فرماتے ہیں:-

"اب یہ جائز نہیں ہے کہ قرآن مجید پر توراۃ یا انجیل وغیرہ کا اطلاق کیا جائے اور یہ الفاظ اسکے لئے استعمال کئے جائیں (الاتقان ج ۱ صہ۵۳)

اگر اسی طرح ڈھیل دیدی جائے

تو جیسے آج علامہ مودودی نے اپنے خطبات کا شجرہ قرآن مجید سے ثابت کرنے کیلئے سارے قرآن مجید ہی کو مجموعۂ تقاریر وخطبات ثابت کردیا ہے کل کو ولایت سے مرعوب کوئی دوسرا مصلح اعظم ان قرآنی سورتوں کو "اسپیچز" کہدے گا اور پھر اسکے بعد اس بنیاد پر کوئی اور ترقی کرکے انھیں "بھاشنوں کا سنگرہ" بھی کہدیگا اسلئے کہ جب خود علامہ مودودی قرآنی سورتوں کو "خطبہ وتقریر" فرما رہے ہیں تو کسی دوسرے کو کیسے منع فرماسکیں گے کہ وہ قرآن کو مجموعۂ تقاریر مجموعۂ خطبات نہ کہے اور پھر اس صورت میں قرآن مجید کی نسبت اللہ تعالیٰ کیطرف تو برائے نام ہی رہجائیگی کیونکہ جب قرآنی سورتیں خطبہ ٹھہریں تو انھیں آپ "خطبات اللہ" تو کہنے سے رہے لامحالہ

آپ "خطبات نبوی" ہی کا نام دے سکیں گے جیسا کہ علامہ مودودی خود اپنے دیباچہ تفہیم میں یوں ارشاد فرما چکے ہیں :-

" حسب موقع وضرورت ایک تقریر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیجاتی تھی اور آپ اسے خطبہ کی شکل میں لوگوں کو سنا دیتے تھے" (دیباچہ ص)

ایسی صورت میں قرآن مجید کی ہر سورت کو تقریر وخطبہ اور "چند خطبات وتقاریر کا مجموعہ کہنا قرآن فہمی کی راہیں کشادہ نہ کرسکے گا نہ ہی اس سے قرآن فہمی میں کوئی مدد ملے گی ہاں اسکا یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ ناظر تفہیم کا ذہن علامہ کی " تحریک مودودیت " اور موصوف کے خطبات کے مضمرات کو باآسانی سمجھنے کیلئے ضرور تیار ہو جائے گا

تدبر قرآن کا نقطہ آغاز اور تفہیم قرآنی کی شاہ کلید

علامہ مودودی نے اپنے مقدمہ تفہیم میں اپنا سارا زور قلم اس موضوع پر صرف فرمانا چاہا ہے کہ قرآن مجید کا فہم وتدبر جو گوناگوں وجوہ واسباب کے باعث خاطر خواہ طور پر نہیں ہو پا رہا ہے اسے وہ اپنی کوششوں سے آسان فرمانا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ موصوف مطالعہ قرآن کا نقطہ آغاز بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :-

" اس سلسلہ میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہونا چاہیئے وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے مگر اس کتاب کے سمجھنے کیلئے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اسکی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اسکے پیش کرنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے

اس تمہید کے بعد علامہ موصوف نے نمبروار چھ باتیں گنائی ہیں جو انکے نزدیک قرآن کی اصل حقیقت اور اسکا نقطہ آغاز ہیں نمبر پانچ پر کچھ تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ پہلی تین باتیں کسی قدر اختصار کے ساتھ اب ذیل میں تبصرہ کیلئے نقل کیجارہی ہیں (پوری عبارات اصل مقدمۂ تفہیم میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے)

(۱) خداوند عالم نے ——— انسان کو پیدا کیا ——— اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری دیکر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا (مقدمۂ تفہیم ۱)

(۲) اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اس کے کان کھولکر یہ بات اسکے ذہن نشین کردی تھی کہ تمھارا اور تمام جہاں کا مالک ومعبود اور حاکم میں ہوں میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو نہ کسی دوسرے کے بندے ہو اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت وبندگی اور پرستش کا مستحق ہے ——— دنیا کی یہ زندگی ——— دراصل تمھارے لئے ایک امتحان کی بات ہے جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کرکے فیصلہ کرونگا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا اور کون ناکامیاب، تمھارے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود وحاکم تسلیم کرو جو ہدایت بھیجوں اسکے مطابق دنیا میں کام کرو اور دنیا کو دار الامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلہ میں کامیاب ہونا ہے ——— اور اگر کسی دوسرے ڈبہ پر چلوگے (جس پر چلنے کیلئے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تمکو فساد

اور بے چینی کا مزہ چکھنا ہوگا اور دنیا سے گذر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جسکا نام دوزخ ہے (مقدمہ تفہیم ص۱۷)

(۳) یہ فہمائش کرکے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد (آدم و حوا) کو وہ ہدایت بھی دیدی جس کے مطابق انھیں اور انکی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا یہ اولین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر انکی زندگی کا آغاز روشنی میں کیا تھا وہ حقیقت سے واقف تھے انھیں انکا قانون حیات بتا دیا گیا تھا (مقدمہ تفہیم ص۱۷)

تخلیق آدم کی چشم دید شہادت

حضرات ناظرین مقدمہ کے اقتباس بالا کو بغور ملاحظہ فرمالیں اور اسکے ساتھ ساتھ علامہ کی وہ تمہید بھی نظر میں رکھیں جو مقدمہ کے ص۱۶ سے اوپر نقل کیجا چکی ہے صاف نظر آجائیگا کہ علامہ نے اپنے دعاوی کے ثبوت میں قرآن مجید اور احادیث شریف سے کوئی آیت و حدیث پیش فرمانے کی زحمت نہیں فرمائی جس سے موصوف کے یہ دعاوی ثابت تو ہو جاتے حالانکہ موصوف اوپر ارشاد فرماچکے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ اصل خدا و رسولؐ کی بیان فرمودہ ہے کہ :-

"اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح کان کھولکر یہ بات اسکے ذہن نشین کردی تھی الخ" ــــــــ اھ

۳۔ "یہ فہمائش کرکے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی الخ"

ایسی صورت میں جبکہ علامہ موصوف ثبوت و دلیل سے صرف نظر فرماتے ہوئے صرف دعووں ہی پر اکتفا فرما رہے ہیں کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ "تخلیق آدم" اور "خلیفہ سازی" کے وقت علامہ موصوف بذات خود موجود تھے جسکی چشم دید شہادت مقدمہ تفہیم کے صفحات میں ادا فرمائی جا رہی ہے۔ اور اگر ہمیں ایسا سمجھنے کی اجازت نہیں ہے اور غالباً یہ اجازت دی بھی نہ جاسکے گی تو ہم اپنے تصور علم و فہم اور قلت تدبر و تحقیق کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صاف لفظوں میں یہ اظہار حقیقت بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ علامہ کے دعاوی اس انداز میں قرآن شریف کی کسی آیت یا کسی مستند حدیث سے ثابت نہ ہوسکیں گے۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس میں غرض تخلیق اور وجہ تخلیق پر روشنی ڈالنے والی آیات بہت مشہور ہیں ایک آیت سورۂ بقرہ کی اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً اور دوسری آیت سورۂ ذاریات کی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ہ یہ دوسری آیت تو علامہ کے مفہوم دعوی سے بڑی حد تک بے تعلق ہی ہے اور پہلی آیت کی تفسیر بھی اگر علامہ کے منشا ہی پر کیجائے تو بھی آیت سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ یہ خلافت آدم کا مسئلہ ہی اصل قرآن ہے تحکم محض ہے جسے علامہ کی امت تو تسلیم کرسکتی ہے دوسروں کیلئے اس سے اتفاق دشوار ہے۔

باقی رہا احادیث کا معاملہ تو احادیث سے بھی علامہ کا دعوی و مدعا پایۂ ثبوت کو نہ پہونچ سکے گا کیونکہ مشہور احادیث میں تو وہ حدیث ہے جس میں حضرت آدم کا اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کے صرف مسجود ملائکہ ہونے کا تو ذکر ہے اجسے علامہ اپنی تفسیر میں متعارف مفہوم کے اعتبار

سے تسلیم فرمانے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں) خلافت ارضی کا تذکرہ نہیں ہے۔

بہر حال اگر علامہ کے ارشادات قرآن و حدیث سے ثابت ہو سکتے ہوں تو فراہمی ثبوت علامہ ہی کے ذمہ ہے مگر یہ پہلو بھی ملحوظ رہے کہ ثبوت کے بعد بھی محض اسی حقیقت کا اصل قرآن ہونا محل کلام اور قابل غور رہے گا۔

میری حاصل مطالعہ مزید تائید ملاحظہ ہو

حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم کراچی) رسالہ بینات کراچی میں علامہ کی تفہیم القرآن پر تبصرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :۔

" مودودی صاحب اصل قرآن اس چیز کو قرار دیتے ہیں کہ " انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے " ـــــ اسلئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافت کا مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے ؟ ـــــ اسکی تشریح انھوں نے اپنے مقدمہ میں پیش نہیں کی حالانکہ اس مقام پہ اسکی ضرورت تھی، مگر اپنی دوسری تحریروں میں انھوں نے اسکی توضیح کی ہے، ملاحظہ ہو دین کا حقیقی مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" مختصر الفاظ میں تو صرف اتنا کہدینا ہی کافی ہے کہ وہ مقصد انسان پر سے انسان کی حکومت مٹا کر خدائے واحد کی حکومت قائم کرنا ہے اور اس مقصد کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے اور جان توڑ کوشش کرنے کا نام جہاد ہے۔ اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کے سب اسی کام کی تیاری کیلئے ہیں " (خطبات ص ۳۲۹)

"گویا دین اسلام کا اصل مقصد ایک ایسا سیاسی نظام قائم کرنا ہے جسکے دستور کی بنیاد اسی اصول پر ہو کہ مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہیں اور وہی حاکم ہیں"

ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ شانہٗ کیلئے ثابت ہے ـــــ اسمیں بھی ہمیں کلام نہیں کہ نظام خلافت اور اسلامی دستور حکومت کی بنیاد اسی اصول پر قائم ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن اور سنت نے ایک سیاسی نظام کی بھی تعلیم دی ہے جو دنیا کے دوسرے نظامات سے مختلف اور بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن ان حقائق کو تسلیم کر لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مودودی صاحب کا یہ خلاف حقیقت دعویٰ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ دین اسلام کا نچوڑ اور اصل قرآن یہی نظام سیاسی اور قیام خلافت ہے۔ خطبات کی عبارت منقولہ سے روشن ہو جاتا ہے کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ کہنے سے انکی کیا مراد ہے۔ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مضامین قرآن کا اصل محور و مرکز اس نظام سیاسی کی تعلیم ہے جو نزول قرآن کا اصل مقصد ہے گویا کتاب مبین دراصل ایک سیاست کی کتاب اور سیاسی دستور ہے اسکے جملہ مضامین اور تعلیمات کی بنیاد و اساس خلافت یعنی ایک سیاسی نظام کی تعلیم ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق کی تعلیم درحقیقت اسی سیاسی تعلیم کی تمہید ہے خود مقصود بالذات نہیں ہے"۔ (رسالہ بینات ص ۱۳ تا ۱۴ بابت جولائی ۷۶ء)

اسکے بعد مولانا اسحٰق صاحب نے علامہ کے خطبات ص۲۵۲، ص۲۵۵ سے کچھ اقتباسات او رنقل فرمائے ہیں، پھر ارشاد فرماتے ہیں:-

" وہ (مودودی صاحب) صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ جب تک دین کا اقتدار زمین پر نہ قائم کیا جائے اسوقت تک دین کے حق ہونیکا اعتقاد لاحاصل اور بے معنی ہے گویا ایمان و اعتقاد کی قدر و قیمت بھی اسلام کے شعبہ سیاست یعنی نظام خلافت سے وابستہ ہے۔ اگر کوئی شخص توحید، رسالت آخرت اور جملہ عقائد اسلام کا قائل ہو اور پختہ عقیدہ و ایمان رکھتا ہو مگر نظام خلافت کیلئے جدوجہد نکرے تو ان کے نزدیک اسکا ایمان لاحاصل، اسکے عقائد رائیگاں اور اسکا یقین بے قیمت ہے۔ (دو سطروں کے بعد فرماتے ہیں)

جس شخص کو قرآن و حدیث سے ذرا بھی مَس (لگاؤ) ہو وہ بغیر کسی کد و کاوش کے سمجھ سکتا ہے کہ انکا یہ نظریہ تصریحات قرآن و حدیث اجماع امت اور عقل دینی کے بالکل خلاف اور سراسر زیغ و ضلال ہے، حق یہ ہے کہ دین کے متعدد شعبے ہیں انمیں سے ایک شعبہ "سیاست" بھی ہے اسے "کل دین" قرار دینا بالکل باطل ہے عامی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اسلام کا سب سے اہم حصہ اسکا شعبہ عقائد ہے اسی پر پورے دین کی بنیاد قائم ہے اسکے بعد شعبہ عبادت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ایمان و عبادت کا مقصد سیاست نہیں بلکہ سیاست و خلافت کا اصل مقصد خود ایمان و عبادت ہے قرآن مجید کا

Scanned with CamScanner

صریح ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر اقتدار عطا کر دیں تو یہ نماز قائم کرینگے زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم اور منکر سے منع کریں گے) ان آیتوں سے روشن ہے کہ اسلام کے نظام سیاسی کا مقصد مسلمانوں کا اقتدار قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کی حفاظت و اشاعت ہے۔ شعبہ عبادات اصل مقصود ہے اور شعبہ سیاسات اسکا محافظ و خادم اسکے بالکل برخلاف مودودی صاحب اسلام کے شعبہ سیاست کو اصل اور نظام عقائد و عبادات کو اسکا خادم اور ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن اس جگہ ہمیں انکے اس غلط نظریے پر تفصیلی بحث مقصود نہیں۔ دکھانا یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید پر اپنے اسی زاویہ معکوس سے نظر کی ہے اور وہ دوسروں کو بھی اسی زاویہ منحرفت سے نظر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ واضح بات ہے کہ جب زاویہ فکر ہی صحیح نہ ہو تو یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ انکی نظر روح قرآن تک پہنچی ہوگی اور انھوں نے قرآن مجید کی (آزاد) ترجمانی میں تحریف نہ کی ہوگی (بینات جمادی الثانی ۱۳۹۱ھ)

واقعہ یہی ہے

بینات کے مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت مولانا محمد اسحٰق صاحب دامت برکاتہم نے

علامہ کے زاویۂ معکوس و منحرف کی بنا پر جو اندیشہ قائم فرمایا ہے وہ بالکل واقعہ اور مبنی بر حقیقت ہے۔

راقم السطور کو بھی علامہ کی تفہیم پر اسی پہلو سے کلام ہے کہ جب موصوف کا زاویۂ فکر ہی معکوس و منحرف ہے تو صراطِ مستقیم تک رسائی کیسے ممکن و متوقع ہو سکتی انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ صفحات میں اسکی مثالیں ملاحظہ میں جلد ہی آنیوالی ہیں۔

مقدمہ کا خاتمہ

اس سرخی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علامہ کی تفہیم القرآن پر تبصرہ ختم ہو رہا ہے تفہیم القرآن پر تبصرہ تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ہے ۔ ابھی تو تفہیم کا "دیباچہ" و "مقدمہ" سمجھنے کی کوشش کیجا رہی ہے، اس سے فرصت پانے کے بعد ہی انشاء اللہ اصل تفہیم القرآن کا مقدمہ (تبصرہ) ناظرین کی عدالت میں پیش کیجا سکے گا۔ اسپنے اس تمہیدی تبصرہ کو (جو تفہیم کے دیباچہ و مقدمہ ہی سے متعلق ہے) کسی قدر محدود و مختصر رکھنے کے خیال سے بعض اعتراضات کو نظرانداز کرتے ہوئے مقدمۂ تفہیم کے ایک آخری اقتباس پر تبصرہ کر کے مقدمہ کا خاتمہ بلکہ فیصلہ ہی کر دینا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید نری مذہبی کتاب نہیں ہے

"قرآن فہمی" کی راہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی تھیں علامہ نے مقدمۂ تفہیم میں تقریباً سب ہی کی نشاندھی فرما کر اپنے زعم میں ہر رکاوٹ دور بھی فرما دی ہے

اس سلسلہ میں مقدمۂ تفہیم کا مندرجہ ذیل اقتباس خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے جس میں موصوف نے بڑے قیمتی قسم کے چند نکتے سپرد قلم فرما دیئے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ تفہیم کا اقتباس' موصوف ارشاد فرماتے ہیں

"فہم قرآن کی ساری تدبیروں کے باوجود آدمی "قرآن کی روح" سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لئے قرآن آیا یہ محض "نظریات و خیالات" کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھکر اسے پڑھیں اور اسکی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسہ و خانقاہ میں اسکے سارے رموز حل کرلیے جائیں یہ ایک دعوت و تحریک کی کتاب ہے" (مقدمۂ تفہیم ص۲۳)

اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ کے چند فقرے اپنی معنی خیزی کے لحاظ سے قابل غور ہیں ایک فقرہ تو "قرآن کی روح" ہے جو علامہ کا خصوصی فقرہ ہے بلکہ سچ پوچھئے تو یہی فقرہ علامہ کی ساری تحریرات کی روح ہے۔ جو حضرات علامہ کی تحریرات پر نظر رکھتے ہوں گے انھیں اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ علامہ کس طرح روح اور اسپرٹ جیسے الفاظ کے پردے میں اپنی بات فرمانے کے عادی ہیں اور دوسرا فقرہ "نری مذہبی کتاب" ہے علامہ کے اس انکشاف پر جسقدر بھی داد دیجائے کم ہے۔

اس قسم کی تعبیرات کا پردہ علامہ بالقصد رکھتے ہیں غرض یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے عالم و مفسر کی قرآن فہمی وغیرہ کی بات کرے تو علامہ بے تکلف بڑی آسانی کے ساتھ یہ فرما سکیں کہ مدرسہ و خانقاہ سے تعلق رکھنے والے علماء مفسرین

ممکن ہے قرآن مجید سمجھ لیں لیکن روح قرآن تک انکی رسائی تو مبر سے ہی فارمولہ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

جی چاہتا ہے کہ اسی موقع پر علامہ سے یہ بھی دریافت کرلیا جائے کہ جناب نے یہ تو ارشاد فرما دیا کہ قرآن مجید کے رموز مدرسہ وخانقاہ میں حل نہیں ہوتے لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ قرآن مجید کے یہ رموز و اسرار آخر کہاں حل ہوتے ہیں؟ دارالاسلام پٹھان کوٹ میں؟ یا سنٹرل جیل ملتان میں؟

ایک علامہ دوسرے علامہ کے نقش قدم پر

مطلع قیادت وامارت پر علامہ مودودی کے ابھرنے سے کچھ ہی پہلے ایک دوسرے علامہ بھی مسلمانان ہند کی دینی قیادت کیلئے "تذکرہ ودیباچہ" کے ساتھ سامنے آئے تھے جنھیں لوگ عام طور پر "علامہ عنایت اللہ مشرقی" کے نام سے جانتے اور یاد کرتے ہیں۔

آنجہانی علامہ نے بھی علمائے دین کا استیصال وخاتمہ ہی کر دینے کی ٹھانی تھی۔ مدرسہ وخانقاہ پر طعن وتشنیع پر وہ ان موصوف سے بہت آگے تھے۔ چنانچہ انھوں نے "مولوی کا غلط مذہب" نامی رسالہ لکھکر کئی نمبروں میں شائع کیا تھا۔ مشرقی تحریک بھی اسی طرح "سیاست وعسکریت" اور "تنظیم واجتماعیت" وغیرہ کے خوشنما روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی اور بڑی تیزی سے پھیلنی شروع ہو گئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور یہی علمائے برحق جن پر بقول علامہ روح قرآن منکشف ہی نہیں ہوئی ہے تردید مشرقیت کیلئے کھڑے ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقیت کی نوخیز کلی بن کھلے ہی

مرجھا گئی اور اپنی موت مر کر ہمیشہ کیلئے دفن ہو گئی۔

علامہ مودودی جو کچھ دنوں پہلے ہی سے علامہ نیاز فتحپوری کے فیض صحبت وتربیت کے سہارے دینی قیادت کی تیاری میں لگے ہوئے تھے استاد نے موصوف کو مسلمانان ہند کی دینی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا اور علامہ نے بھی گرد و پیش کے پورے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیکر بجا طور پر یہ سمجھ لیا کہ انکو مارکیٹ میں صحیح مقام اور بازار میں ساہوکاری اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ اپنے آپ کو "ماڈرن انداز" کا لیڈر بنا کر پیش کریں۔

اس سلسلہ میں موصوف کیلئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ علمائے دین حق کو بھی اپنے طنز وتعریض کا نشانہ بنائیں چنانچہ موصوف نے یہ اہم دینی خدمت بڑی شان کے ساتھ انجام دی ہے۔ علامہ نے اپنی مشہور تصنیف "تجدید واحیائے دین" میں حضرات علمائے مجددین پر اور اپنی دوسری تصنیف "خلافت وملوکیت" میں خلیفہ راشد داماد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ کرامؓ پر جو تنقیدیں فرمائی ہیں ان کو دیکھنے کے بعد موصوف کا مدارس وخانقاہ پر یہ طنز تو بہت کم درجہ رکھتا ہے جو ابھی مقدمہ کے اقتباس بالا میں نقل کیا گیا ہے۔ "تجدید واحیائے دین" کے کچھ اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائے جائیں۔

(الف) "تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبہ یا چند شعبوں ہی میں

کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے (تجدید و احیائے دین صنـ۳۱)

(ب) (امام غزالیؒ پر تبصرہ فرماتے ہوئے) " مگر امام موصوف کے کارنامے میں یہ سیاسی رنگ محض ضمنی حیثیت رکھتا تھا سیاسی انقلاب کیلئے انھوں نے کوئی باقاعدہ تحریک نہیں اٹھائی نہ حکومت کے نظام پر کوئی خفیف سے خفیف اثر ڈال سکے اسی لئے جاہلیت کی حکمرانی میں مسلمانوں قوموں کی حالت خراب ہوتی چلی گئی" (صـ۴۵)

(ج) علامہ ابن تیمیہؒ پر تبصرہ فرماتے ہوئے) "تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکلکر اسلام کے ہاتھ میں آجائیں" (صـ۴۸)

(د) (حضرت مجدد صاحبؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ پر تبصرہ فرماتے ہوئے)" پہلی چیز جو مجھکو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور انکے خلفاء کے تجدیدی کام کھٹکتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور انکو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی"۔ (صـ۷۳)

الغرض علامہ موصوف نے ان مصلحین و مجددین اور اکابر و اسلاف نیز انکے مدارس و خانقاہ سے اپنا رشتہ و تعلق اس طرح توڑ لیا کہ اب وہ مدرسہ و خانقاہ پر فقرہ بازی کرتے اور پھبتی کسنے میں بھی شاید فخر ہی محسوس کرتے ہیں اور ہمارے

علماء اکابرین کو یہ انداز خاص تو آتا نہیں کہ فرعونی طرز کو اپناتے ہوئے وہ بھی ان سے یوں دریافت فرمالیں الم نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ٥ کیا ہم نے اپنے درمیان رکھکر تیری تربیت بچپن میں نہیں کی اور تو نے ہمارے درمیان اپنی عمر کے کئی سال نہیں گذارے (شعراء)

اس موقع پر اسی سلسلہ میں یہ انکشاف حقیقت لطف سے خالی نہو گا کہ موصوف جس مدرسہ و خانقاہ پر طنز و تبرا فرما رہے ہیں پہلے کبھی وہ بھی اسی مدرسہ و خانقاہ کے فیض یافتہ حضرات سے استفادہ فرما چکے ہیں۔ دہلی کے زمانہ قیام میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے صحبت و مشورہ اور حضرت مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے انکا تلمذ و استفادہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، اور مولانا کاندھلوی مدرسی بھی تھے اور خانقاہی بھی کہ حضرت حکیم الامۃ علیہ الرحمہ کے مجازین و خلفاء میں داخل تھے مگر ایسا لگتا ہے کہ علامہ موصوف اب اپنے احساس "انا امیرکم ابوالاعلیٰ" کے کیف و سرور میں اپنا وہ ماضی فراموش فرما چکے ہیں

کیا یہ سراسر احسان فراموشی اور محسن کشی نہیں ہے

اقتباس مندرجہ بالا میں علامہ نے جس طنز آمیز اور حقارت خیز انداز میں مدرسہ و خانقاہ کا ذکر فرمایا ہے اسکو پڑھکر یقین نہیں آتا کہ یہ عبارت اس شخص کی "ترواش فکر" اور "رشحات قلم" سے ہو سکتی ہے جو علیٰ منہاج النبوہ تحریک اقامت کا داعی مطلق اور حکومت الٰہیہ کا امیر الکل ہونے کا مدعی ہے۔

یہ کیسی کھلی ہوئی احسان فراموشی اور کیسی زبردست محسن کشی ہے کہ علامہ

ان مدارس وخانقاہ پر پھبتی کس رہے ہیں' ان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ یہی مدرسہ وخانقاہ ہی دین کے وہ صحیح منبع ومرکز رہ چکے ہیں جنکی بدولت سرمایۂ دین وایمان اور ذخیرۂ قرآن وسنت ہم مسلمانوں تک پہونچ سکا اور جن کے علمی وکتابی فیوض سے بقدر ظرف وصلاحیت خود علامہ نے بھی فائدہ اٹھایا ہی ہوگا! ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ کی موجودہ معلومات میں ان مدارس وخوانق کا توسط و ذریعہ شامل نہیں ہے بلکہ علامہ نے براہ راست مبدء فیاض سے اکتساب فیض وتلقی فرمائی ہے یا پھر یہ سب کچھ "استاذی" کی طرف سے القا ہوا ہے؟

اور اگر علامہ کی موجودہ معلومات میں ان "مدارس وخوانق" کو بھی دخل ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے تو ازراہ کرم ہمیں بتایا جائے کہ علم کی تاریخ میں احسان فراموشی کی ایسی مثال کہیں کوئی اور بھی ملتی ہے؟

ہم اپنی معلومات کی حد تک تو یہی سمجھتے ہیں کہ علم اور اہل علم کی تاریخ میں ایسی مثال ہرگز نہ مل سکے گی۔

ہوئی "تطویل" تو کچھ "باعث تطویل" بھی تھا

(۱) راقم السطور نے علامہ کی تفہیم سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی خطرناکیوں کی نشاندہی کرتے میں اشارات و اختصار کا انداز پسند نہیں کیا، ہمارا مقصد یہ تھا کہ وہ زہرناکیاں جو علامہ کی تفہیم کے بین السطور ہی دیکھی جا سکتی ہیں وہ پوری طرح آشکارا ہو کر ناظرین تبصرہ کے سامنے آجائیں اور علامہ موصوف نے تفہیم القرآن میں اپنے ناظرین کی جو "نظر بندی" فرمائی ہے اسکا پردہ چاک کر دیا جائے اس لئے یہ آپریشن

زرا گہرا کرنا پڑا اور بات کچھ طویل ہوتی چلی گئی۔

(۲) تطویل کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ راقم السطور کو حوالہ میں تفہیم سے کے اقتباسات بھی پیش کرنے تھے جن میں حذف و اختصار کا طرز بالکل ہی مناسب نہ تھا کہ پھر تو بہت سے حضرات زیر تبصرہ آئے ہوئے اقتباسات میں "قطع و برید" کا ریماک دیکر پورے ہی تبصرہ کو نظرانداز اور ناقابل توجہ قرار دینے کیلئے ایک بہانہ تلاش کرلینے میں کامیاب ہوجاتے اسلئے راقم السطور نے پوری صحافتی دیانت وامانت کو محفوظ رکھتے ہوئے تفہیم کی عبارتیں جہاں بھی نقل کی ہیں بالعموم پوری ہی نقل کی ہیں مگر افسوس کہ "اجتماع" کے نام پر انتزاق کی کوشش کرتے والے حضرات اور قبل از وقت حاصل مطالعہ دریافت کرلینے والے ماہرین کے حلقوں سے حوالوں میں "قطع و برید" کی صدا لگاکر مظلومیت کی دہائی دی جارہی ہے اس اندھیر اور زبردستی کا علاج تو شاید حکیم لقمان کے پاس بھی نہ ہوگا۔

(۳) تیسری وجہ یہ کہ راقم السطور نے اپنی کم علمی اور گمنامی کے باعث علامہ کے طرز عمل کے برخلاف اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اپنی تمام تر معروضات کو اکابر و سلف کی تائیدات سے بھی بھرپور رکھا ہے۔

ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ جو ہوا کہ ۲۵ صفحات کے دیباچہ و مقدمہ پر یہ تبصرہ خاصا طویل ہوتا جارہا ہے۔

ضروری وضاحت

راقم السطور کا زیر نظر تبصرہ جو بالاصل تو علامہ کی تفہیم القرآن سے متعلق ہے

مگر ضمناً وتبعاً یہ تبصرہ خود علامہ موصوف اور انکی تحریک مودودیت سے متعلق بھی ہے اور چونکہ تفہیم القرآن کی غرض تصنیف بھی مودودیت کی تبلیغ واشاعت ہی ہے اسلئے راقم السطور کے اس تبصرہ کا موضوع بھی بڑی حد تک علامہ کی مختلف تحریرات اور انکی تحریک کے مضمرات ہی ہیں۔

ہو سکتا ہے بعض حضرات کو راقم السطور کی اس تحریر میں علامہ کیلئے اس قسم کے جذبہ احترام وعقیدت کی کچھ کمی محسوس ہوتی ہو جس کا لحاظ کسی دینی عالم اور قابل احترام شخصیت کیلئے ضروری سمجھا جاتا ہو تو بڑی صفائی کے ساتھ یہ وضاحت کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف سے راقم السطور کا تعلق کافی پرانا ہے اور ان سے اس قسم کا ربط وتعلق بھی بہت قدیم ہے جسکی سرگذشت بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے آپ بھی ملاحظہ فرمالیں:۔

حوالہ غلط نکل گیا

اب سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے جب راقم السطور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں زیر تعلیم تھا (یہ زمانہ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک رہا ہے) اسوقت جماعت کے مومنین اولین میں سے چند مشہور حضرات جماعت سے علیٰحدہ ہو چکے تھے اور علامہ کے خلاف مضامین کا ایک ہنگامہ سا برپا تھا: مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا حبیب احمد صاحب کیرانوی اور خود مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کے مضامین صدق میں برابر نکل رہے تھے۔ اسی زمانہ میں احقر نے استاد محترم حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم کی نشاندھی ورہنمائی سے علامہ کی

مشہور کتاب "حقوق الزوجین" کی بحث "ایلار" پر ایک مراسلہ نما مختصر سا مضمون بھی لکھا (یہ راقم السطور کی مضمون نویسی کی ابتدا تھی جو علامہ کی تنقید و تعاقب کی شکل میں ہوئی تھی) یہ مراسلہ اسی دور میں "صدق" کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا (اندازہ ہے کہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہوگا کیونکہ ترجمان القرآن کی وہ خاص اشاعت جس میں حقوق الزوجین کا مضمون مجموعی طور پر شایع ہوا ہے وہ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء کا مشترک شمارہ ہے) علامہ نے ترجمان القرآن کی اس خاص اشاعت میں مسئلہ ایلا پر بحث کرتے ہوئے جو فقہی تحقیقات سپرد قلم فرمائی ہیں اس میں تو قلمی و صحافتی امانت و دیانت کو شاید بالائے طاق ہی رکھدیا ہے۔

علامہ کی اس صحافتی چابکدستی کا پردہ چاک کرنے کیلئے احقر نے وہ مضمون لکھا تھا جس میں مختصراً صرف یہ بات دکھلائی گئی تھی کہ علامہ نے حصاص رازی کی "احکام القرآن" کے حوالہ سے جو فقہی تحقیق سپرد قلم فرمائی ہے اسے تحریف و تبدیل اور تخلیط و تلبیس تو کہا جا سکتا ہے لیکن تحقیق تو کسی طرح بھی نہ کہا جا سکے گا۔

علامہ موصوف نے اس سلسلہ میں کہ ایلار میں حلف و قسم شرط ہے یا نہیں احکام القرآن جصاص رازی کے ص۴۲۰ ج۱ کے حوالہ سے جو بات اپنے مذکورہ بالا ترجمان میں نقل فرمائی ہے لطف کی بات یہ ہے کہ جصاص کی کتاب احکام القرآن میں دور دور تک اسکا پتہ نہیں ہے اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ صفحہ ۴۲۰ کا یہ حوالہ دفعہ ۴۲۰ کیطرف تو اشارہ نہیں ہے۔

ناظرین کی سہولت کیلئے ہم علامہ موصوف کی پوری عبارت کے ساتھ ساتھ بقدر ضرورت احکام القرآن کی اصل عبارت کا ترجمہ بھی بالمقابل نقل کئے دیتے ہیں

عبارت ترجمان القرآن مودودی :۔"اس مسئلہ میں بعض فقہار نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلار ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ اس سے دس برس بھی علحدہ رہے اس پر ایلار کا اطلاق نہ ہوگا لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کیخلاف ہے قانون کا اصل اصول یہ ہے لا یکلف اللہ نفسًا الا وسعہا کسی شخص کو اسکی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیجا سکتی، اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے مقصد یہ کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کیلئے ہونی چاہیئے جسکو وہ برداشت کر سکتی ہو اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالا یطاق ہے اور اسکا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہو جائے جس سے مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت مذکورۃ الصدر کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا، قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور قسم کھانے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام میں جو لوگ ثقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی و حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم انکی رائے اس باب میں یہی تھی کہ "ضرار کی نیت سے

عورت کو چھوڑ دینا ایلار ہے خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو۔

(احکام القرآن للجصاص الحنفی ج ۱ صفحہ ۴۲۲)

(منقول از ترجمان القرآن بابت جولائی و اگست ۱۹۴۱ء)

(جلد ۱۸۔ عدد ۴، ۵، ۶)

خلاصہ احکام القرآن للجصاص الحنفی : اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ کوئی شخص کس وقت ایلار کا مرتکب قرار پائیگا

(۱) ایک مسلک تو وہ ہے جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بروایت حسن و عطا مروی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے عدم قربت کی قسم اس وجہ سے کھاتا ہے کہ وہ ابھی دودھ پلا رہی ہے تو ایسی قسم کی وجہ سے (جو عذر معقول پر مبنی ہو) وہ شخص مُولِی نہ ہوگا بلکہ وہ صرف اسوقت ہی مولی ہوگا جبکہ اس نے عدم قربت کی یہ قسم عورت سے ناراض ہوکر اسے تکلیف دینے کی نیت سے کھائی ہو۔

(۲) دوسرا مسلک وہ ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت میں مروی ہے کہ عدم قربت کیلئے ہر قسم ایلار مانی جائیگی خواہ وہ رضا و خوشی کے ساتھ ہو یا غصہ و ناراضگی میں ہو۔ یہ قول ابراہیم (نخعی) ابن سیرین اور شعبی کا ہے

(۳) تیسرا مسلک وہ ہے جو حضرت سعید بن مسیب رضؓ سے مروی ہے کہ ایلار صرف عدم قربت ہی کی قسم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ

عدم کلام وغیرہ پر بھی اگر قسم کھالی تو یہ ایلاء ہو جائے گا۔

(۴) چوتھا مسلک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عورت کو صرف چھوڑ دینا ہی ایلاء ہے قسم ہونے کی شرط نہیں ہے (احکام القرآن ص۳۵۵ و ص۳۵۶)

(چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں) اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایلاء میں یمین و قسم مضمر ہے ایلا کا مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی عورت سے صحبت ترک کرنے پر قسم کھالے کیونکہ اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ ترک صحبت کی قسم کھانیوالا مولی ہو جائیگا (چند سطروں کے بعد) وہ روایت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ عورت کو صرف چھوڑے رکھنے ہی سے طلاق ہو جاتی ہے (اسکے لئے حلف و قسم کی ضرورت نہیں ہے) تو یہ روایت قول شاذ ہے۔ اور کتاب اللہ کے خلاف ہے"

(احکام القرآن ص۳۵۶)

کجا آں شورا شوری کجا ایں بے نمکی

ناظرین کرام ہر دو کالموں کو بغور ملاحظہ فرما کر فیصلہ فرمائیں کہ علامہ مودودی نے اپنے ترجمان القرآن میں کس زور و شور سے ایلاء میں "حلف" کی شرط کو اسلامی قانون کی اسپرٹ کے خلاف قرار دیا ہے اور اپنے زعم میں ان صحابہ کرام رض کو "تفقہ فی الدین" کے شرف سے بھی محروم گردان دیا ہے جو ایلاء میں "حلف" کو شرط

قرار دیتے ہیں اور علامہ نے اپنی دانست میں یہ تو بڑے کمال ہی کا مظاہرہ فرمایا ہے کہ اپنے پسندیدہ مسلک کے خلاف مسلک کی تردید کیلئے (جسے شاید وہ صرف بیچارے حنفیہ ہی کا مسلک خیال کر رہے ہیں) ایک مشہور حنفی المسلک محقق کی کی کتاب کا حوالہ بھی دیدیا ہے جس سے مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ حنفیہ کے مسلک خلاف تائیدات خود انھیں کی کتابوں میں موجود ہیں' واقعہ یہی ہے کہ "ہتھیلی پر چراغ" رکھکر اس طرح مظاہرۂ تحقیق دوسرا کوئی آسانی سے ہرگز نہیں کر سکتا۔

"احکام القرآن" کی ضروری عبادات کا مطلب نیز ترجمہ اور خلاصہ اوپر نقل ہو چکا ملاحظہ فرمائیں کہ علامہ جصاص رازی نے ایلاء میں "حلف" کے شرط ہونے یا نہ ہونے سے متعلق صحابہ کرام کے کیا کیا مسلک نقل کئے ہیں اور اُنکی تصریحات کے برخلاف علامہ اپنے ترجمان میں کیا ترجمانی فرما رہے ہیں ؟ اور امام جصاص رازی کی تحقیق کے بالمقابل یہ بھی ملاحظہ فرمالیں کہ جصاص کے نزدیک وہ روایت جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے (کہ عورت کو صرف چھوڑے رکھنا ہی ایلاء اور موجب طلاق ہے خواہ حلف ہو یا نہ ہو) تو یہ قول، قولِ شاذ اور کتاب اللہ کے خلاف ہے لیکن علامہ کی ترجمانی کے مطابق یہی قول شاذ قانون اسلامی کی اسپرٹ کے عین مطابق ہے اور حضرات صحابہ کرام میں سے جو حضرات تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے علامہ مودودی کے نزدیک وہ سب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ امام جصاص کی تحقیق کے مطابق واقعہ یہ نہیں ہے جیساکہ اوپر نقل ہوا کہ چار مسلکوں میں سے اوپر کے تین مسلکوں کے مطابق ایلاء میں بالاتفاق "حلف" شرط ہے ہاں مسلک اول کے مطابق اس حلف میں قصد ضرار بھی ملحوظ و مشروط ہے جو

دوسرے مسلک میں نہیں ہے صرف چوتھا مسلک جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے وہ ایسا ہے جس میں ایلا ربغیر حلف بھی ہو جائے لیکن امام کے نزدیک یہ قول شاذ اور کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

راقم السطور نے اپنے صدق والے مراسلہ میں علامہ کی اسی "چابکدستی" پر تبصرہ کیا تھا مگر صدق میں حوالہ کی اس کھلی ہوئی غلطی کی نشاندھی شائع ہو جانے پر بھی علامہ نے اس وقت تو بظاہر اسکا کوئی نوٹس لیا اور اسکی اصلاح و تصحیح سے متعلق کوئی اعلان نہ فرمایا۔ یہ بات قرین قیاس نہ کہی جا سکے گی کہ علامہ کو صدق میں شائع ہونے والے اس مراسلہ کی کوئی اطلاع نہ ہوئی ہوگی جبکہ اسوقت صدق ہی ایک اخبار تھا جس میں متعدد حضرات کے مضامین علامہ کے خلاف مسلسل شائع ہو رہے تھے ہاں یہ بات دوسری ہے کہ علامہ نے اسے اپنے شایان شان ہی نہ سمجھا ہو کہ وہ زبردست متکلم اسلام اور واحد امیر المسلمین ہو کر ایک ادنی درجہ کے گمنام طالب علم کی بات پر کان دھریں جبکہ وہ اسوقت بھی کسی بڑے سے بڑے عالم تک کو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہ تھے۔

ایک نظر ماضی پر بھی

یہ صرف مضمون نگاری نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ علامہ نے اپنی انشاپردازی اور صحافت کے جادو سے بڑے بڑے حضرات اہل علم کو اپنی طرف متوجہ کیا بہت سے لوگ انکے گرد جمع ہو کر داخل حلقہ بھی ہوئے، اردو عربی زبانوں میں تصنیفات لکھکر "مودودیت" کو نہ صرف ہند و پاک بلکہ بیرون ملک عربی ممالک میں پھیلنے اور

پھولنے پھلنے کا موقع دیا۔ ایسے سارے ہی حضرات جب تک علامہ کے چشم و ابرو کے اشارہ پر کام کرتے رہے وہ سب زبردست صاحب علم و تحقیق اور مومن و مجاہد رہے لیکن جہاں کسی کو علامہ کی کسی رائے و تحقیق سے اختلاف ہوا تو علامہ نے فوراً ہی اسکا علم و فضل اسکی صلاحیت تحقیق اور اسکا جذبۂ ایمان و مجاہدہ سب ہی اس سے سلب فرمالیا۔ اس سلسلہ میں کسی شخصیت کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہے یہ فہرست خاصی طویل ہے۔

حوالہ بدل گیا

حوالہ کی غلطی پر صدق میں تنبیہ شایع ہونے کے کافی عرصہ کے بعد ایکبار کچھ حضرات کے سامنے "حقوق الزوجین" کی اس بحث کا ذکر چل رہا تھا ضرورت پڑی کہ اپنے مخاطب صاحبان کو "احکام القرآن" کے اسی مذکورہ بالا حوالہ کی وہ غلطی جو "ترجمان القرآن" میں موجود ہے دکھلادوں انہیں سے ایک صاحب فوراً وہ کتاب بھی لے آئے اب جو کتاب دیکھتا ہوں تو اپنی "نظر بندی" پر حیرت کرتا ہوں کہ وہاں تو اپنی بات کی بنیاد ہی غائب ہے یعنی "احکام القرآن جصاص حنفی" کی جگہ حوالہ میں "احکام القرآن ابن العربی" لکھا ہوا ہے ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ پہلے کیا تھا اور اب لکھا کیا ہے

حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار دیکھتا ہوں مگر اب تو ہر بار احکام القرآن ابن العربی ہی کا حوالہ لکھا ہوا نظر آتا ہے اور احکام القرآن جصاص حنفی کا دور دور تک پتہ نہیں ملتا آخر خیال آیا کہ ذرا کتاب کا ایڈیشن تو دیکھا جائے یہ کوئی دوسرا ایڈیشن نہ ہو یہ خیال

صحیح نکلا ایڈیشن کی کیفیت دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ کوئی دوسرا ہی ایڈیشن ہے۔ جس ایڈیشن کی بنیاد پر صدق میں تنبیہ کی گئی تھی وہ اس سے پہلے کا ایڈیشن تھا۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ علامہ کی یہ صحافتی قلابازی تھی جس سے ہم سب بے خبر نکلے۔

اس دوسری اشاعت میں جو دیباچہ تھا اس میں یہ انکشاف بھی تھا کہ علامہ مودودی کو کسی صاحب نے خط کے ذریعہ حوالہ کی اس غلطی پر مطلع کیا تھا مگر یہ کچھ ذکر نہ تھا کہ ان مکتوب نگار صاحب کو حوالہ کی اس غلطی کا علم واحساس براہ راست از خود ہوا تھا یا انکا ذریعہ علم وہی مضمون صدق تھا؟

علامہ نے ان صاحب کے ذریعہ اطلاع پاکر بڑی فراخدلی سے صرف حوالہ کی اصلاح قبول فرمائی کہ ایلاء سے متعلق جس قول کو وہ قانون اسلامی کی اسپرٹ کے عین مطابق فرما چکے تھے بات تو اب بھی وہی رہی مگر حوالہ میں احکام القرآن للجصاص کی جگہ ابن العربی کا نام دیدیا گیا۔

خیر وہ بات آئی گئی ختم ہوگئی۔ احقر بھی قدرے مطمئن ہوگیا کہ چلو خیر علامہ نے کسی نہ کسی درجہ میں حوالہ کی غلطی کا دبی زبان ہی میں سہی اعتراف تو کرلیا اب جب تک حقوق الزوجین کے ساتھ یہ دیباچہ شایع ہوتا رہے گا پڑھنے والوں کو یہ ثبوت تو فراہم ہوتا رہے گا کہ موصوف اس سے پہلے داد تحقیق کس طرح دے چکے ہیں اور صحافتی قلابازی کے ذریعہ احکام القرآن للجصاص سے احکام القرآن ابن العربی تک پہونچ گئے ہیں

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے " اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا "

تو اپنا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ مختلف مشاغل اور مصروفیات سے سابقہ رہتا ہے اتنی فرصت کسے کہ ہر تیسرے روز یہ خبر بھی لیتا رہے کہ علامہ نے کب اپنی کون سی عبارت کس کتاب میں صاف کردی ہے اور کامیابی کے ساتھ پسپائی قبول کرلی ہے۔ ابھی اس مشغولی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر کچھ لوگوں کے سامنے علامہ کی اس "صحافتی دیانت" پر تبصرہ کر رہا تھا اور اپنی بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کیلئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان حضرات کو دیباچہ کی وہ وضاحت دکھلاکر علامہ جیسے محقق سے بھی حوالہ کی غلطی صادر ہوجانے کا یقین تو دلایا جائے مگر واہ رے علامہ واہ! ہم قائل ہوگئے آپ کی فنکاری کے۔ اب جو کتاب منگاکر دیکھی جاتی ہے تو وہاں وہی مثل سامنے آتی ہے کہ "نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری" یعنی اب تو شروع کتاب میں وہ دیباچہ ہی نہیں ہے جسمیں کسی صاحب کے خط کے حوالہ سے پچھلے حوالہ کی غلطی کا خاموش اعتراف موجود تھا نتیجہ یہی ہوا کہ علامہ سچے اور ہم جھوٹے۔

اب تو صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ علامہ نے ایلار کی بحث کو جس انداز میں پہلے تحریر فرمایا تھا اس ساری عبارت کا بالکل حلیہ ہی بدل دیا ہے۔ اب تو یہ پہچاننا بھی مشکل ہوگیا ہے کہ یہ حقوق الزوجین کا وہی مبحث ہے اور اسکے وہی مصنف ہیں یا کسی دوسرے نے اسی نام سے کوئی رسالہ تصنیف فرما دیا ہے۔ لیکن حوالہ میں ابن عربی کا ذکر خیر دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ رسالہ اور مصنف تو ایک ہی ہے لیکن عبارات کی صحافتی قلابازیوں نے اسکا حلیہ بالکل بدلکر رکھدیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں شائع ہونے والے مضمون "حقوق الزوجین" کی متعلقہ عبارت

کے ساتھ ساتھ اب ذرا سولہ سال بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہونے والے "حقوق الزوجین" (طبع چہارم) کی عبارت کا حلیہ ملاحظہ فرمالیں۔

ہر دو عبارات متعلقہ نقل کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طبع چہارم کے مختصر دیباچہ کی بھی چند سطریں ملاحظہ میں آجائیں۔ علامہ فرماتے ہیں کہ :-

"سترہ سال ہوئے یہ کتاب ایک مسلسل مضمون کی شکل میں شایع کی گئی تھی اور دس سال سے یہ کتابی شکل میں شایع ہو رہی ہے۔ اگرچہ اول روز ہی یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ فقہ حنفی کے ازدواجی ضابطہ میں جو اصلاحات اسکے اندر تجویز کی گئی ہیں انکی حیثیت فتویٰ کی نہیں بلکہ تجاویز کی ہے جو علماء کے سامنے اس غرض سے پیش کیجارہی ہیں اگر وہ انکو شرعی اور عقلی دلائل کے لحاظ سے درست پائیں تو ان کے مطابق فتویٰ میں تبدیلی کر دیں۔ لیکن اسکے باوجود آج تک نہ تو اسکی تجاویز پر سنجیدہ غور کیا گیا اور نہ کسی نے علمی تنقید کی تکلیف اٹھائی البتہ اسے میرے خلاف فتنہ برپا کرنے کا ذریعہ پہلے بھی بنایا گیا تھا اور اب بھی بنایا جارہا ہے فالی اللہ المشتکی"

اس تمہید کے بعد حقوق الزوجین طبع اول اور طبع چہارم کی عبارات کا تقابلی مطالعہ فرمایا جائے۔ ملاحظہ ہو :-

عبارت حقوق الزوجین (طبع اول ۱۹۴۱ء)

(مبحث ایلاء)

"اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے

اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلار ہوگا اور یہ حکم
جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی
اس سے علٰحدہ رہے اس پر ایلار کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن یہ بات
قانون اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے قانون کا اصل الاصول
یہ ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا کسی شخص کو اسکی برداشت
سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاسکتی۔ اس قاعدۂ کلیہ کے ماتحت
قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔
مقصد یہ کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا
صرف اتنی مدت کے لئے ہونی چاہیئے جبکو وہ برداشت کرسکتی ہو
اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالایطاق ہے اور اسکا
بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے
عورت مرد کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت
مذکورہ کا اصل مدعا محض یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے
سے زیادہ مدت کیلئے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا تو یہ اس مسئلہ
میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا۔ قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف
میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور قسم کھالینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا
صحابۂ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی
رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر)
ان کی رائے اس بارے میں یہی تھی کہ "ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا

ایلاء ہے خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو" (احکام القرآن للجصاص الحنفی ج۱ ص ۴۲۰)

(ترجمان القرآن بابت جولائی و اگست جلد ۱۸ عدد ۴، ۵، ۶)

عبارت حقوق الزوجین (طبع چہارم ۱۹۵۷ء)

(مبحث ایلاء)

" اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاء ہوگا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اس سے علیٰحدہ رہے اس پر ایلاء کا اطلاق نہ ہوگا لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں میرے دلائل حسب ذیل ہیں" (حقوق الزوجین طبع چہارم ص ۲۹)

(اسکے بعد علامہ نے طبع اول کی وہ ساری عبارتیں (جس میں قانون اسلامی کی اسپرٹ اور قانون کا اصل الاصول وغیرہ بیان فرماتے ہوئے تفقہ فی الدین کا شرف رکھنے والے صحابہ کرام کے اقوال کی تائید کے ساتھ اپنا پسندیدہ مسلک بیان فرمایا تھا) حذف فرما دی ہیں اور ص ۲۹ سے ص ۳۱ تک اپنی صلاحیت اجتہاد کا مظاہر فرماتے ہوئے متعدد قیاسات اور عقلی استدلالات پیش فرمائے ہیں جو اگرچہ انکے اپنے ذاتی استدلالات ہرگز نہیں ہیں لیکن موصوف نے انھیں "میرے دلائل" فرما کر اپنا بنا لیا ہے، خوف طوالت سے ہم حذف کرتے ہوئے آگے پڑھتے ہیں) پھر ص ۳۱ پر

فرماتے ہیں :-

" ان وجوہ سے میرے نزدیک فتویٰ فقہائے مالکیہ کے مسلک پر ہونا چاہیئے جو فرماتے ہیں کہ اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے مباشرت ترک کردے تو اس پر بھی ایلار ہی کا حکم لگایا جائے گا اگرچہ اس نے قسم نہ کھائی ہو کیونکہ ایلار پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصود ضرار کو روکنا ہے اور یہ علت اس ترک مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حلف کے بغیر بقصد ضرار کیا جائے " (حوالہ حاشیہ پر یہ ہے) (احکام القرآن ابن عربی جلد ۱ صفحہ ۷۵ اور ہدایۃ المجتہد ابن اسد ج ۱ صفحہ ۸۵)

قابل غور باتیں

" حقوق الزوجین " طبع اول اور طبع چہارم کی عبارات میں مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں :-

(الف) ہر دو عبارات میں " ایلار " کیلئے " حلف " کا شرط ہونا صرف بعض فقہار کا مسلک بتایا گیا ہے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ نکلتا ہے کہ جمہور فقہار کرام ایلار کیلئے " حلف " کو شرط نہیں مانتے

(ب) طبع اول میں اسی مسلک کو ان صحابہ کرام کا مسلک بھی قرار دیا دیا گیا ہے جو علامہ کے زعم میں تفقہ فی الدین کے شرف سے مشرف تھے مگر طبع چہارم میں خدا جانے کس وجہ سے استدلال کا یہ پہلو یکسر اڑا دیا گیا ہے۔ ع

اونمی دانست یادانستہ اخفاکردہ اند

(ج) طبع اول میں تو ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کا مسلک نامزد طور پر ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا لیکن طبع چہارم کے اول مبحث میں بعض فقہار کے عنوان سے ایک مسلک ذکر فرمایا گیا ہے (جو طبع اول میں بھی مذکور ہے) اور صرف طبع چہارم کے تقریباً آخری مبحث میں صرف امام مالک علیہ الرحمہ کے نام سے ایک دوسرا مسلک بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ جو علامہ کا پسندیدہ مسلک ہے۔ اس موقع پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول مبحث میں بعض فقہار سے علامہ کی مراد کیا ہے اور اس سے کون حضرات مراد ہیں بظاہر الفاظ عبارت کا تاثر تو یہی ہے کہ جمہور فقہار کا مسلک اس کے مخالف ہے لیکن طبع چہارم کے آخری مبحث میں صرف حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا ذکر یہ پتہ دیتا ہے کہ دوسرے ائمہ ثلاثہ ان کے ساتھ نہیں ہیں اگر یہ تاثر صحیح اور مطابق واقعہ ہے تو پھر "مسلک جمہور" تو وہ مسلک قرار پائے گا جسے علامہ اول مبحث میں "بعض فقہار" کا مسلک قرار دے چکے ہیں۔

ایسی صورت میں مسلک جمہور کے لئے "بعض فقہار" کی تعبیر علامہ کی فنکارانہ صحافت پر ایک روشن دلیل ہی کہی جا سکتی ہے۔

یہ تنقیحات تو جملہ معترضہ کے طور پر زیر بحث آگئیں ورنہ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کا موقع تو آیت ایلار کی تفسیر میں آئے گا انشار اللہ تعالیٰ اسوقت ہم اس مسئلہ کو مالۂ و ما علیہ کے ساتھ پوری تفصیل سے ذکر کریں گے۔

لوٹ پیچھے کو ذرا ابلق ایام ابھی

تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ پہ جائزہ و تبصرہ بفضلہ تعالیٰ کافی تفصیلی انداز میں پیش خدمت کیا جا چکا ہے اس طرح گویا ہم تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش میں ایک مرحلہ طے کر چکے ہیں اور قاعدہ سے تو اب اصل تفسیر تفہیم القرآن کے جائزہ و تبصرہ کا مرحلہ شروع ہو جانا چاہیئے مگر ہم نے اپنی ذہنی ترتیب کار کے مطابق دیباچہ و مقدمہ سے متعلق علامہ مودودی کے بعض ارشادات پر اپنا تبصرہ ملتوی کر دیا تھا کیونکہ موصوف کے وہ ارشادات انکی آزاد ترجمانی اور تفسیری حواشی کی پالیسی سے متعلق تھے اور ہمارے خیال میں ان پر بحث و گفتگو کا صحیح موقع و محل اسی وقت تھا جب ہم دیباچہ و مقدمہ کے اور دوسرے مباحث سے فارغ ہو کر موصوف کی ترجمانی و تفسیر کو موضوع تبصرہ بنائیں۔

چنانچہ ہم اب جبکہ موصوف کی ترجمانی و تفسیر کا بالاستیعاب جائزہ لینا چاہتے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بطور نمونہ چند مثالیں موصوف کی ترجمانی و حواشی تفسیر سے متعلق بھی پیش کر دیں۔

اس مقصد کیلئے ہم آپ کو ذرا دیر کیلئے پھر دوبارہ علامہ کے "دیباچہ تفہیم" کیطرف واپس لے چلتے ہیں اور دیباچہ تفہیم کے چھوڑے ہوئے دو اقتباسات اپنے تبصرہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارے تبصرہ کا یہ حصہ تفہیم کے دیباچہ و مقدمہ اور اصل تفسیر سے متعلق بحث و تبصرہ کی ایک درمیانی کڑی ہے۔

علامہ موصوف دیباچہ تفہیم میں اپنی آزاد ترجمانی کی تشریح فرماتے ہوئے

اپنی صفائی اس معصومانہ انداز میں پیش فرماتے ہیں :-

اقتباس اول

"اس طرح کے آزاد ترجمے کے لئے یہ تو بہرحال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطلب کی عبارت کی جائے لیکن معاملہ کلام الٰہی کا تھا اسلئے میں نے ڈرتے ہی ڈرتے یہ آزادی برتی ہے جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے"

(دیباچہ تفہیم ص۱۱)

ناظرین کرام! اقتباس بالا کو بغور ملاحظہ فرمائیں مجھے پوری امید ہے کہ غالباً میری طرح آپ بھی اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ موصوف نے اس پارۂ عبارت میں اپنی آزاد ترجمانی اور تفسیر نگاری کی پالیسی متعین فرمانی چاہی ہے۔

راقم السطور کے نزدیک علامہ کا مدعائے نگارش اور عبارت بالا کا مرکزی خیال یہی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا قلب مبارک خدا تعالیٰ کے خوف خشیت اور احتیاط و تقویٰ سے ایسا لبریز ہے کہ بالکل غیر ارادی طور پر ہی خوف و خشیت کے کے کچھ اثرات نہاں خانہ دل سے چھلک کر زبانِ قلم کے ذریعہ صفحات تفہیم پر بھی بکھر گئے ہیں۔

اقتباس بالا کے خط کشیدہ فقروں کے بین بین اگر پڑھنے کی کوشش

تو صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئی جذبہ مستور علامہ کو انکی اس آزاد ترجمانی سے کس کس طرح روک رہا تھا مگر موصوف ایسے ناگزیر حالات میں تھے کہ انتہائی مجبوری کے ساتھ انھیں لفظی ترجمہ کی پابندیاں توڑ کر ادائے مطلب کی جسارت کرنی پڑی اور کلام الٰہی ہونے کی بنا پر معاملہ کی نزاکت کا پورا پورا احساس رکھکر بہت ہی ڈرتے ڈرتے انھوں نے یہ آزادی برتی ہے اور اسمیں " ممکن حد تک احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسکا پورا اہتمام فرمایا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہو اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

اللہ اللہ! کیا ٹھکانا ہے اس ورع و تقویٰ کا؟ اس خوف و رجا امید و بیم کا؟ کیسا حسین و دلکش مرقع ہے علامہ کا یہ شہ پارۂ عبارت کہ موصوف نے ایک طرف تو اظہار خوف و خشیت اور استہار حذر و احتیاط میں تکرار الفاظ او تنوع اسالیب کا سہارا لیتے ہوئے اپنے خوف و خشیت کی وہ تصویر کھینچکر رکھدی ہے جس سے اچھی تصویر آسانی سے کھینچی بھی نہ جاسکتی تھی اور دوسری طرف ایک بہت ہی سادہ و معصوم اور انتہائی مبہم ہونے کے ساتھ ساتھ بیحد معنی خیز سا یہ فقرہ بھی جوڑ دیا کہ " قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہو اس سے آگے نہ بڑھنے پائے "

اب یہ بات کیسے معلوم کہ

قرآن کی اپنی عبارت علامہ کے نزدیک کتنی آزادی زبان کی گنجائش رکھتی ہے؟ اور وہ کس موقع پر اپنی اس پیشگی اعلان فرمودہ گنجائش سے کیا فائدہ حاصل فرمالینا چاہیں گے؟ اور ایسی صورت میں کہ علامہ نے بقلم خود اپنے

احتیاط و تقویٰ اور خوف و خشیت کی مکمل تصویر کشی بھی پہلے ہی فرما دی ہے بھلا اب کسے مجال ہے کہ موصوف کے احتیاط و تقویٰ پر شک و شبہ کی نگاہ بھی ڈال سکے

علامہ کو دوسرے مترجمین کے برخلاف "ترجمہ پن" چھوڑ کر "آزاد ترجمانی" کا بانکپن اپنانے میں اصل ترجمہ کی بجائے " نفس ادائے مطلب کی عبارت بھی کرنی پڑی ہے ـــــ بظاہر تو یہ تعبیر ایک سادہ و معصوم سی وضاحت نظر آتی ہے مگر جو غور سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ موصوف کی وضاحت بھی بجائے خود ان کی "معذرت نما عبارت" ہے اور علامہ نے اس معذرت نما انداز میں اپنی عبارت کا اقرار و اعتراف فرماکر اپنی تفہیم میں آزاد ترجمانی کی آڑ میں کی جانے والی عبارتوں کیلئے راہ جواز نکال لی ہے

مقصد یہ ہے کہ موصوف کی اس پیشگی معذرت و وضاحت کے بعد اگر کوئی ناظر تفہیم کسی موقع پر علامہ کی ترجمانی میں کسی قسم کی "آزادی" یا "بے راہ روی و گمراہی" محسوس بھی کرے تو وہ موصوف کو کسی طرح بھی مورد الزام و اعتراض قرار نہ دے سکے اور یہ سمجھکر مطمئن ہو جائے کہ یہ گمراہی اور بے راہ روی تفسیر بالرائے نہیں ہے بلکہ یہ آزاد ترجمانی کی عبارت ہے جسکی وضاحت اور معذرت موصوف پہلے ہی پیش فرما چکے ہیں۔

لیجئے مثال بھی حاضر ہے

سطور بالا میں راقم السطور نے جو کچھ عرض کیا ہے یہ محض ظن و تخمین پر مبنی صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ثبوت میں مثال بھی موجود ہے۔ علامہ کی تفسیر

تفہیم القرآن جلد اول میں ص ۶۴ پر سورۂ بقر رکوع ۴ آیت ۳۴ کی آزاد ترجمانی اور تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو

حضرات ناظرین کی سہولت کے پیش نظر ہم اس آیت کے مختلف تراجم بھی تقابلی مطالعہ کیلئے پیش کر رہے ہیں کہ مختلف تراجم بیک نظر سامنے آجائیں اور علامہ کی آزاد ترجمانی کے پردے میں چھپی ہوئی آزادی اور "آزادروی" بے نقاب ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ اس آیت متعلقہ کا ترجمہ ہمارے دوسرے اکابر مفسرین نے کیا فرمایا ہے اور علامہ نے اسکی آزاد ترجمانی فرماتے ہوئے کیا جسارت زبانی ہے اور قرآن مجید میں آئے ہوئے لفظ نے انھیں کس حد تک واقعی "آزادی زبان" کا فائدہ دیا ہے اور کس حد تک وہ زبردستی بڑھ گئے ہیں :-

آیت ۳۴ سورۂ بقر رکوع ۴ بابت سجود ملائکہ

آیت شریف: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

آیت مذکورہ بالا کے متعدد تراجم :-

(۱) ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ :-

۱- " جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ میں گر پڑے مگر ابلیس نے قبول نہ رکھا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں کا "

(۲) ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ :-

۲- " جب کہا ہم نے واسطے فرشتوں کے سجدہ کرو واسطے آدم کے

پس سجدہ کیا مگر شیطان نے نہ مانا اور تکبر کیا اور تھا کافروں سے"

(۳) ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب علیہ الرحمہ :-

۳- "اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان اس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ تھا کافروں میں کا"

(۴) ترجمہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی علیہ الرحمہ

۴- "اور جبکہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے، اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا"

(۵) ترجمہ حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف صاحب تھانوی علیہ الرحمہ

"اور جس وقت ہم نے حکم دیا فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور ہو گیا کافروں میں سے"

(۶) ترجمہ مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی علیہ الرحمہ

۶- "اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا بجز شیطان کے اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافر بن گیا"

(۷) ترجمہ مولانا حافظ فتح محمد خاں صاحب جالندہری علیہ الرحمہ

"اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا"

Scanned with CamScanner

(۸) علامہ مودودی کی ترجمانی:۔

"پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا"

(تفہیم القرآن ص۶۴ ج اول چودھواں ایڈیشن)

ناظرین کرام نوٹ فرمالیں!

کس طرح علامہ نے جملہ مترجمین سے الگ ہو کر اپنی آزاد ترجمانی کی نئی راہ نکالی ہے اور سجدہ کا متعارف ترجمہ (جسے مستند و معتمد مفسرین نے بالعموم اختیار کیا ہے) چھوڑ کر صرف جھک جانے ہی کو سجدہ قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ و شاہ رفیع الدین صاحبؒ سے لیکر اب تک جملہ مستند و معتبر، متداول و متعارف تراجم میں ہر مترجم نے حکم سجدہ سے یہی متعارف سجدہ مراد لیا ہے، اور قاعدہ سے یہی مراد لینا بھی چاہیئے کیونکہ قرآن مجید دین و شریعت کی کتاب ہے اسمیں اصل و حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ سجدہ سے اسکے شرعی و اصطلاحی معنی ہی مراد لئے جائیں۔ اس موقع پر سجدہ کا لغوی مفہوم مراد لینا بالکل خلاف حقیقت ہوگا اور حقیقت سے عدول اسی وقت صحیح ہو سکتا تھا جب یہ معنی روایات حدیث سے ثابت بھی ہوتے اسلئے آیت بالا میں سجدہ سے وہی "متعارف سجدہ" مراد ہوگا۔

احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے مخاطب اول حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت میں آئے ہوئے سجدہ کو اسکے متعارف شرعی معنی ہی پر محمول فرمایا ہے۔ مفسر کبیر علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر میں چند روایات

نقل فرمائی ہیں ملاحظہ ہوں :-

(۱) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ روز قیامت جملہ مومنین طالب شفاعت کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونگے اور کہیں گے "آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور آپ کے سامنے اپنے فرشتوں کو سربسجود کیا اور آپکو ہر چیز کے نام سکھائے لہٰذا ہمارے لئے آپ شفاعت فرما دیں اور ہمیں یہاں سے نجات دلائیں آپ فرمائیں گے کہ میں اس لائق نہیں ہوں" (پوری حدیث کافی طویل ہے حسب موقع اسی قدر پر اکتفا کیجاتی ہے) (بخاری شریف کتاب التفسیر و تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۲ ج ۱)

(۲) اسی تفسیر ابن کثیر میں ص ۱۳۶ ج ۱ پر وہ روایت ہے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست فرمائی ہے کہ "اے میرے پروردگار مجھے ان آدم کو دکھلائیے جنھوں نے ہم سب کو اور خود اپنے آپ کو جنت سے نکلوا دیا پھر جب وہ ان کے ساتھ اکٹھے ہوئے تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ آپ ہی وہ آدم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں اپنی روح پھونکی اور انکو اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا" (تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۶ ج ۱ جمع الفوائد ص ۱۴۰ ج ۲)

(۳) تیسری روایت تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) میں ہے "ابن ابی الدنیا مکائد الشیطان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ شیطان نے ایک روز حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت سے سرفراز فرمایا ہے اور ہم کلام ہوا ہے میں گنہگار توبہ کرنا چاہتا ہوں، آپ

Scanned with CamScanner

میری سفارش فرمادیں اور میرے لئے دعاء فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اچھا میں دعاء کرونگا۔ اسکے بعد آپ نے اپنی مناجات کے وقت دعاء فرمائی، حق تعالیٰ کی طرف سے جواب میں وحی آئی کہ میں نے آپکی سفارش قبول کی اسکی توبہ مان لی اب اس سے کہئے کہ آدم کی قبر کی جانب سجدہ کرے۔ آپ نے اسکو بتایا تو بولا کہ جب میں نے زندہ کو سجدہ نہ کیا تو اب مردہ کو کیا کرونگا۔ (تفسیر عزیزی ص۱۴۸ ج۱)

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ابن آدم (انسان) آیت سجدہ پڑھتا ہے اور سجدۂ تلاوت کرتا ہے تو شیطان کنارہ کھڑا ہوکر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے ہلاکت ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اُسنے سجدہ کرلیا اب اُسکے لئے تو جنت ہے اور مجھے سجدہ کو کہا گیا تو میں نے نافرمانی کی لہٰذا میرے لئے دوزخ ہے (مسلم شریف مسند امام احمد۔ بحوالہ مظہری ص۵۵ ج۱ بغوی برابن کثیر ص۱۴۰ ج۱)۔

الغرض روایات حدیث اور حضرات مفسرین کے مشہور اور معتمد اقوال کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ آیت زیر بحث میں حکم سجدہ سے یہی متعارف سجدہ ہی مراد ہے سجدہ کے شرعی اور اصطلاحی معنی چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا روایت ودرایت دونوں ہی کے خلاف ہے۔

اور علامہ نے تو اپنے تفسیری حاشیے میں اور ترقی فرماتے ہوئے سجدہ کو اطاعت وانقیاد وغیرہ کے مفہوم میں مستعمل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو صرف انکی اپنی "اپج" اور تفسیر بالرائے ہی کہی جائیگی۔

انشاء اللہ تعالیٰ ہم اپنی اس کتاب کی جلد دوم میں علامہ کی تفہیم پر

مزید روشنی ڈالیں گے

انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچہ پکڑنا

ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ کی شان میں اس محاورہ کا استعمال شاید بعض ان حضرات کو پسند نہ آئے جو علامہ کی ذہنی غلامی ہی کو اپنا سرمایۂ افتخار تصور فرماتے ہوں لیکن ہم معذور ہیں اور ہمیں اپنے قصور انشا و تحریر کا اعتراف بھی ہے کہ علامہ کی اس صحافتی چابکدستی کیلئے کوئی دوسرا موزوں ترین محاورہ ہم تلاش نہ کر سکے اور مجبوراً ہمیں موصوف کیلئے یہ محاورہ استعمال کرنا پڑا۔

اس محاورہ کے استعمال کی ضرورت یوں پڑی کہ علامہ نے آیت بالا کی آزاد ترجمانی فرماتے ہوئے مفہوم آیت میں جو تبدیلی لانا چاہی تھی وہ تو موصوف کی صرف آزاد ترجمانی سے پوری نہ ہو سکی تھی اسلئے موصوف کو مزید ضرورت ہوئی کہ وہ اپنے مدعائے دلی کی تکمیل کیلئے اس موقع پر تفسیری و تشریحی حاشیہ بھی تحریر فرما دیں چنانچہ موصوف نے اسی آیت ۲۳۴ سے متعلق ایک حاشیہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں:

(حاشیہ نمبر ۴۵) " اسکا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جسقدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا چونکہ اس علاقہ میں اللہ کے حکم سے انسان کو خلیفہ بنایا جا رہا تھا اسلئے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اسے

ایسا کر لینے کا موقع دیدیں تو تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جن جن کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرہ کی حد تک اسکا ساتھ دے وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کیلئے جائے دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی (چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں)

فرشتوں کو آدم کیلئے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا اسکی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی، ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

(حاشیہ ۴۴ آیت ۳۴ ص ۶۵ جلد اول)

آیت بالا کے مفہوم میں تحریف اور مسجودیت آدم سے صاف انکار

تفہیم القرآن کا یہ حاشیہ پوری تفصیل کے ساتھ آپ نے ملاحظہ فرمایا اب ہم چاہتے ہیں کہ علامہ کے اس حاشیہ کے پوشیدہ مندرجات کو بھی اچھی طرح واضح و آشکار کر دیں کہ ہمارے ناظرین بھی ہماری طرح علامہ کی اس صحافتی چابکدستی سے باخبر اور اس فنکارانہ تحریف معنوی سے خبردار بھی ہو جائیں

اس حاشیہ کے مندرجات و مضمرات کو موٹے موٹے چند عنوانات میں یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

(الف) فرشتوں کو سرے سے سجدۂ آدم کا حکم ہی نہیں کیا گیا تھا۔

(ب) سجدے سے مراد انقیاد و تسخیر ہے یا بطور علامت انقیاد کسی ظاہری فعل کا حکم بھی دیا گیا ہوگا۔

(ج) وہ ظاہری فعل بھی سجدہ تو بہر حال نہیں تھا۔

(د) حکم سجدہ کے مخاطب و مامور تمام فرشتے نہ تھے بلکہ صرف طبقۂ زمین کے فرشتے مامور تھے۔

(ھ) مسجودیت یعنی تسخیر و انقیاد کا یہ اعزاز بھی مخصوص طور پر حضرت آدم کیلئے نہ تھا بلکہ یہ سازگاری عام انسانوں کے لئے تھی۔

(د) خدا تعالیٰ نے عام انسانوں کو بدی کے ارتکاب کا اذن بھی دے رکھا ہے۔

(ز) انسان جو برائی یا بدی کرتا ہے فرشتوں کیلئے اسمیں سازگاری یا تعاون کرنا خدا تعالےٰ نے انکے ذمہ فرض فرما دیا ہے۔

ہر ایک عنوان سے متعلق اب ترتیب وار تفصیل بھی ملاحظہ ہو:۔

(الف) علامہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کو سرے سے سجدہ آدم کا حکم ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان سے تو صرف جھکنے کو کہا گیا تھا چنانچہ وہ سب جھک بھی گئے تھے (مگر واہ رے ابلیس کم بخت ذرا سا جھکنے کے لئے بھی تیار نہ ہوا) یا انھیں حضرت آدم کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے اور انکے لئے سازگاری کرنے کا حکم دیا گیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیدیا ہو (جسکی کوئی صحیح صورت و کیفیت علامہ متعین بھی نہیں فرما سکے ہیں ہو سکتا ہے فرشتوں سے یہ کہا گیا ہو کہ وہ سب حضرت آدم کو سلوٹ (SALUTE) دیں جیسا کہ آجکل ہوتا ہے۔

ہم اوپر حدیث شریف کی چند روایات نقل کر آئے ہیں جن سے یہ بات بالکل واضح طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے آگے حقیقی سجدہ ہی کا حکم دیا گیا تھا اور عام مفسرین نے یہی تفسیر اختیار فرمائی ہے جیسا کہ اردو تراجم سے سات مختلف ترجمے بھی ہم نقل کر آئے ہیں اب عربی تفسیروں میں سے بھی چند حضرات مفسرین کی تفسیرات اور انکی رائیں ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ علامہ جار اللہ زمخشری معتزلی اپنی تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں :۔
"سجدہ اللہ تعالیٰ کیلئے تو بطور عبادت ہوتا ہے اور غیر اللہ کیلئے اکرام کے طور پر ہوتا ہے جیسا کہ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا تھا" (تفسیر کشاف ص ۶۲ ج ۱)

۲۔ علامہ ابن جریر طبری شیعی اپنی تفسیر طبری میں فرماتے ہیں :۔
"امام قتادہ فرماتے ہیں کہ اسجدوا لآدم (آدم کو سجدہ کرو) اس حکم میں طاعت اور فرماں برداری حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے ویسے سجدہ حضرت آدمؑ ہی کو ہوا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کے اکرام کا اظہار فرمانے ہی کے لئے کیا کہ اپنے فرشتوں سے حضرت آدم کو سجدہ کرایا"
(تفسیر طبری ج ۱ ص ۱۷۶)

۳۔ علامہ قمی نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں :۔
"صحیح ترین قول یہی ہے کہ یہ سجدہ زمین پر پیشانی رکھنے ہی کی شکل میں تھا لیکن بطور عبادت نہ تھا بلکہ حضرت آدم کے اکرام ہی کیلئے تھا"
(تفسیر غرائب القرآن برحاشیہ تفسیر طبری ص ۲۳۴ ج ۱)

۴۔ علامہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اسی سلسلہ میں تین اقوال

نقل فرمائے ہیں :۔

(۱) سجدہ کے لغوی معنی یعنی انخنار (جھک جانا) لیکن اس معنی کی تضعیف وتردید فرمادی ہے

(۲) سجدہ کے معنی شرعی مراد لیتے ہوئے حضرت آدم کو مسجود نہ مانا جائے بلکہ انکی حیثیت جہت سجدہ اور قبلہ کی مانی جائے اس معنی کی کھلی تضعیف وتردید کردی ہے۔ (از راہ اختصار ہم ان دلائل سے تعرض نہیں کرتے ورنہ انھوں نے مدلل اور معقول طور پر ان دونوں قولوں کی پر زور تردید فرمائی ہے)۔

(۳) سجدہ کے معنی شرعی مراد لیتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہی کو مسجود بھی مانا ہے مگر اسی تفصیل کے ساتھ کہ طاعت و فرمانبرداری تو حکم اللہ ہی کی ہو رہی ہے ہاں اسکے حکم سے سجدہ حضرت آدم کو ہوا ہے اور یہ سجدہ حضرت آدم کی تکریم کے لئے تھا۔ چنانچہ پچھلی امتوں میں سلام و تحیۃ کا یہ طریقہ جائز تھا (تفسیر کبیر ص۲۸۱ ج۱)

۵۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں اس آیت کی تفسیر یوں شروع فرماتے ہیں " حضرت آدم پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ بہت بڑا انعام واکرام ہے جسے اللہ تعالیٰ انکی اولاد پر جتلا رہے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہی خبر دے رہے ہیں کہ انھوں نے فرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم دیا تھا جس پر بہت سی احادیث بھی دلالت کرتی ہیں (یہ احادیث ہم اوپر نقل کر چکے ہیں) (ابن کثیر ص۱۲۵ ج۱ و ۱۳۶)

Scanned with CamScanner

اسکے بعد آگے چل کر ص۱۴۰ پر علامہ ابن کثیر نے بھی حضرت قتادہ کی وہی تفسیری روایت نقل فرمائی ہے جو ہم طبری کے حوالہ سے اوپر نقل کر آئے ہیں، پھر تفسیر کبیر کے حوالہ سے سجدہ کی تفسیر میں وہی تین اقوال انھوں نے بھی نقل فرمائے ہیں اور ان اقوال سہ گانہ سے متعلق اپنا فیصلہ بھی اس طرح ارشاد فرما دیا ہے:۔

والاظهرات القول الاول اولى والسجدة لادم اكراماً واعظاماً واحتراماً وسلاماً وهى طاعة الله عزوجل لانها لامتثال امره تعالى وقد قواه الرازى فى تفسيره وضعف ما عداه من القولين الاخرين

ترجمہ: مضبوط بات یہی ہے کہ پہلا قول ہی بہتر ہے یعنی سجدۂ آدم انکے اکرام و تعظیم اور احترام و سلام کے طور پر تھا اور حقیقتاً یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طاعت تھی کیونکہ اسی کے حکم کی تعمیل کے لئے تھی۔ اور امام رازی نے اپنی تفسیر میں اسی کو قوی قرار دیا ہے اور بقیہ دو قولوں کی تضعیف فرما دی ہے (ابن کثیر)

الغرض متعدد روایاتِ حدیث اور روایات مفسرین کے بالمقابل علامہ کی یہ آزاد ترجمانی کہ سجدہ سے مراد صرف جھکنا ہے (بلکہ اسکا بھی یقین نہیں ہے کہ جھکنا ہی مراد ہو) سراسر غیر معقول اور بالکل خلاف منقول ہے جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

(ب) آیۂ شریفہ کے تفسیری حاشیہ میں علامہ نے شوق اجتہاد میں یا اپنی انفرادیت

کی نمائش میں سجدہ کے مشہور و متعارف معنی کو نظر انداز تو کر ہی گئے اور ترجمانی کے وقت جھکنے کا ترجمہ لکھ گئے لیکن انکی مدعائے دلی کی تکمیل اس لفظ سے ہو نہ سکتی تھی اسلئے حاشیہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ

۱۔" زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقہ کائنات میں جسقدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کیلئے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا" (پھر اس مطیع و مسخر کی مزید وضاحت فرمانے کے بعد فرماتے ہیں)

۲۔" فرشتوں کو آدم کیلئے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا اسکی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی (یعنی) ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو"

آخر یہ سیماب وشی کیسی ؟

علامہ کی یہ سیماب وشی اور بیقراری کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ بار بار بات کا پہلو بدلتے جارہے ہیں کسی ایک بات پر قرار نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ کسی مفسر کا سہارا لینا اور تفسیر بالمنقول کرنا موصوف کو اپنی شان و مقام سے فروتر نظر آتا ہے اسلئے کتب تفسیر کے ذریعہ وہ آیت شریفہ کا مطلب متعین کرنا بھی نہیں چاہتے اور تفسیر نویسی کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ کوئی پروفیسر مارکہ علامہ تفسیر لکھ ڈالے اور اگر کوئی ایسی جسارت کرے گا تو یہی حشر ہوگا جو ہم آپ اسوقت علامہ کا دیکھ رہے ہیں کہ ذرا سی دیر میں بات کے دو پہلو بدل چکے ہیں لیجئے اب یہ تیسرا پہلو بھی ملاحظہ ہو

۳۔" یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل

کا بھی حکم دیا گیا ہو"

واہ واہ۔ ع: "لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"۔ علامہ! صرف اس ایک سجدہ کو تسلیم کر لینے میں آپ کو اتنی گرانی محسوس ہو رہی ہے کہ آپ کسی طرح سجدہ کو اسکے اصلی سجدہ کے معنی میں لینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور قلابازی پر قلابازی کھائے جا رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دین و شریعت تو خدا کے مقرر کردہ احکام کا نام ہے جس خدا نے یہ فرمایا الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری من نازعنی قاصمتہ (کبریائی میری ردا (چادر) اور عظمت میرا لباس ہے اس معاملہ میں جو مجھ سے مقابل ہوگا میں اسے چور چور کر دونگا)

اسی خدا نے اسجدوا لآدم کا حکم دیکر تمام فرشتوں کو آدم کے روبرو سربسجود کرا دیا تو اب ہم آپ کون ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو دین کا مسئلہ یاد دلائیں کہ یا حضرت! غیر اللہ کو سجدہ جائز ہی کہاں ہے ؎

کوئی دلیل ہو نہ جو صلہ یہی مسئلہ یہی فیصلہ
جو وہ حکم دے تو حلال ہے جو وہ روک دے تو حرام ہے

ذرا یہ سادگی بھی ملاحظہ ہو

کہ علامہ یہ تو فرما رہے ہیں (کہ ممکن ہے اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو) مگر اس ظاہری فعل کی تعیین فرمانے سے صاف پہلو تہی بھی فرما رہے ہیں کون جانے علامہ کا خیال شاید یہی ہو کہ فرشتوں سے کہا گیا ہوگا کہ جلد آؤ حضرت آدم کو سلوٹ (SALUTE) دو جیسا کہ آجکل

ہوتا ہے۔ علامہ اگر سجدہ کا پرانا رواج نہ مانیں تو اسے تو مان ہی لیں۔

(د) "حکم سجدہ کے مامور و مخاطب تمام فرشتے نہ تھے بلکہ صرف طبقۂ زمین کے فرشتے ہی مامور تھے"

حاشیہ بالا کے ابتدائی فقرے دوبارہ بغور ملاحظہ فرمالیں کہ علامہ صرف انھیں فرشتوں کے مامور ہونے کی صراحت فرمارہے ہیں جو زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں متعین و مقرر تھے۔

علامہ کی اس چشم پوشی پر ہم اپنی آنکھیں کیسے بند کرلیں کیونکہ محقق مفسرین کرام کی تفسیرات اور خود آیت شریفہ کے الفاظ علامہ کے خیال کی پرزور تردید کرتے ہیں علامہ نے اتنا بھی خیال نہ فرمایا کہ یہ قصہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہوا ہے اور اصول تفسیر کا مشہور قاعدہ ہے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن مجید کا ایک حصہ قرآن کے دوسرے حصہ کی تفسیر بھی کرتا ہے) اسلئے اگرچہ سورۂ بقر میں صرف فَسَجَدُوا لیکن سورۂ حجر میں فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ کے الفاظ آئے ہیں ان الفاظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہدینا کہ ملائکہ سے صرف وہ فرشتے مراد ہیں جو طبقۂ زمین سے متعلق ہیں الفاظ قرآن مجید سے صریح چشم پوشی ہے کہ الملئکۃ جمع کا صیغہ ہے الف لام استغراق احاطہ کے لئے آتا ہے۔ کلھم اور اجمعون دو دو الفاظ تاکید بھی موجود ہیں آگے الا ابلیس کا استثنا بھی آرہا ہے ایسا استثنا بھی عموم حکم کا فائدہ دیتا ہے۔ ایسے واضح دلائل سے چشم پوشی ایسی نہیں کہ اس سے چشم پوشی کرلی جائے

اس بات کا کیا جواب ہوگا؟ اگر بقول علامہ یہ بات مان بھی لی جائے کہ

تمام فرشتے مخاطب نہ تھے تو کون جانے شیطان ابلیس کو بھی شاید کچھ اسی قسم کی غلط فہمی نہ ہوگئی ہو اور حکم سجدہ کا مخاطب وہ خود اپنے آپ کو سمجھا ہی نہ ہو کیونکہ جیسا کہ مشہور ہے وہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ بود و باش رکھتا ہی تھا جو علامہ کے نزدیک امر سجدہ کے مخاطب ہی نہ تھے۔

بہر حال علامہ نے حکم سجدہ کو ملائکۂ ارضی کے ساتھ مخصوص کر کے اگر ایک طرف حضرت آدم علیہ السلام کے اکرام میں کٹوتی فرمانے کی کوشش کی ہے تو دوسری جانب منکر سجدہ کے لئے ایک نئی وجہ انکار بھی تلاش کر دی ہے خدا جانے علامہ کی اس مفت سفت کی وکالت کا علم اس مؤکل کو بھی ہو سکا ہو گا کہ نہیں؟

اقوال مفسرین بھی اسکی تائید کرتے ہیں

جیسا کہ اشارۃً یہ بات اوپر مذکور ہو چکی کہ آیت شریفہ کے ظاہری الفاظ سے پوری طرح یہ بات متعین سی ہو جاتی ہے کہ تخلیق آدم کے وقت تمام ہی فرشتوں سے یہ ذکر ہوا تھا کہ روئے زمین پر خلیفہ مقرر ہونے والا ہے پھر مظاہرۂ تعلیمی میں حضرت آدم علیہ السلام کی نمایاں کامیابی پر بطور اکرام "سلامی" میں جو سجدہ کرایا تھا اسکے امور و مخاطب بھی تمام ہی فرشتے تھے اسلئے عام طور پر مفسرین نے قصہ کے اس پہلو پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی ہے اور اس بات کو بالکل غیر ضروری موشگافی سمجھکر نظرانداز ہی کر گئے ہیں۔

تفسیر کی جو کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکی ہیں ان میں سے چند ہی حضرات نے اس پہلو سے تعرض فرمایا ہے جنکی رائیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں:-

Scanned with CamScanner

۱۔ امام فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اگرچہ دونوں ہی قول نقل فرمائے یعنی تمام[1] ہی فرشتے مامور و مخاطب تھے، دوسرے[2] یہ کہ صرف روئے زمین کے فرشتے مخاطب تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ لکھتے ہیں اکثر صحابہ و تابعین یہی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بغیر کسی تخصیص کے تمام جماعتِ ملائکہ کو دیا تھا کیونکہ الملٰئکۃ کے لفظ سے عام مفہوم ہی سمجھ میں آتا ہے لہٰذا تخصیص کی بات کرنا بالکل خلاف اصل ہے (تفسیر کبیر ص ۲۵۱ ج ۱)

۲۔ علامہ بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں فرماتے ہیں اس بارہ میں اختلاف ہے کہ حکم سجدہ کا خطاب کن فرشتوں کو تھا بعض حضرات نے کہا ہے کہ طبقۂ زمین ہی کے فرشتوں کو یہ خطاب تھا لیکن "صحیح ترین" بات یہی ہے کہ یہ خطاب تمام فرشتوں کے لئے عام تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے فسجد الملٰئکۃ کلھم اجمعون۔

۳۔ علامہ قمی نے اپنی تفسیر میں پہلے تو تخصیص کی بات نقل کی پھر علامہ رازی کی طرح (تفسیر بغوی بر حاشیہ ابن کثیر ص ۱۳۶ ج ۱) اکثر صحابہ و تابعین کے حوالہ سے عام فرشتوں کا مخاطب ہونا ظاہر قرار دیا ہے (تفسیر قمی بر حاشیہ طبری ص ۲۰۸)

۴۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں تفسیر کبیر کے حوالہ سے وہی دونوں قول ذکر فرمائے ہیں مگر اس موقع پر امام رازی کی طرح محض نقل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی رائے اور اپنا فیصلہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "الفاظ قرآنی" کے ظاہر سے عموم حکم ہی سمجھ میں آتا ہے یعنی حکم سجدہ تمام ہی فرشتوں کو دیا گیا تھا چنانچہ اسی واقعہ سے متعلق دوسری آیت میں الفاظ قرآنی اس طرح آئے ہیں فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِکَۃُ کُلُّھُمْ

اَجۡمَعُوۡنَ اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ ط (سجدہ کیا "تمام ہی" ملائکہ" نے "سب کے سب نے" ایک ساتھ "اجتماعی طور پر") اس طرز تعبیر میں عموم کا حکم ثابت کرنے کے لئے چار چار قرائن و دلائل ہیں جن سے قول عموم کو تقویت ملتی ہے تفصیل کیلئے اہل کتب کی طرف مراجعت فرمائی جاسکتی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۱ ج ۱)

۵ ۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی اپنی فارسی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں: ۔ "الملٰئکۃ یعنی فرشتگان را از علویین و سفلیین زیرا کہ خلافت آدم و مزیت او بر ہمہ آنہا ثابت شدہ بود پس تخصیص ملائکہ بسفلیین وجہے ندارد و مخالف روایات است" (تفسیر عزیزی ص ۱۴۲ اسورۂ بقرہ) (ترجمہ: "ملائکہ" یعنی آسمان و زمین کے تمام ہی فرشتوں کو حکم دیا گیا کیونکہ آدم کی خلافت اور فضیلت ان سب ہی پر ثابت ہو چکی تھی لہٰذا صرف طبقہ زمین کے فرشتوں کو خطاب کیلئے مخصوص کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے اور یہ بات روایات کے بھی خلاف ہے) اسکے بعد حضرت شاہ صاحب نے بعض روایات نقل بھی فرمائی ہیں جنمیں آسمانی فرشتوں کے سجدہ کا ذکر موجود ہے شائقین تفسیر عزیزی میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

۶ ـــ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے "بیان القرآن" کی تلخیص و تسہیل کے ساتھ کچھ اضافات فرماتے ہوئے ایک تفسیر "معارف القرآن" تحریر فرمائی ہے اسمیں فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو معارف القرآن ص ۱۸۸ ج ۱) ۔ " اس سے ثابت ہوا کہ سجدۂ آدم کا ذکر اسوقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کیلئے عام تھا جنمیں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں

شاید کسی کو خیال ہو کہ علامہ مودودی کو ایسی کیا پریشانی لاحق ہوگئی تھی

کہ وہ روایت و درایت کے بالکل ہی خلاف ایسی بات لکھ گئے، موصوف اگر حکم سجدہ کا مخاطب تمام ملائکہ ہی کو مان لیتے جیسا کہ خود الفاظ قرآنی ہی سے ظاہر بھی ہو رہا ہے یہ بات انکی آزاد ترجمانی سے متعلق یا لیسی کے خلاف بھی تو نہ تھی، اسکا جواب مختصراً یہی دیا جا سکتا ہے ۔ ع ۔ سخن شناس نہ، دلبرا خطا اینجاست ۔

ہمارے محترم ناظرین ذرا اس پہلو پر بھی تو نظر رکھیں کہ "تفہیم القرآن" کی تصنیف میں علامہ کا مرکزی خیال اپنی "مزعومہ حکومت الٰہیہ" کے لئے "ذہن سازی" ہے اسی لئے تو فرشتوں پر بھی ڈورے ڈالنے کی کوشش فرمائی جا رہی ہے اور "سجدہ آدمؑ" جیسی مشہور و معروف و مسلّمہ و متفقہ حقیقت پر پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ سجدہ کا مطلب یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ سجدہ سے سجدہ مراد ہی نہیں ہے بلکہ "انسان" کے لئے فرشتوں کو صرف "سازگاری" کرنے کا حکم دیا گیا تھا جو وہ ابتک کئے جا رہے ہیں مگر افسوس علامہ نے فرشتوں کو ملانے اور توڑنے کی اتنی کوشش کر ڈالی پھر بھی فرشتوں نے حکومتِ الٰہیہ میں موصوف کے لئے کوئی سازگاری نہ کی ۔

کیا ملا عرض مدعا کر کے ۔۔۔ بات بھی کھوئی التجا کر کے

ظاہر ہے کہ اگر علامہ کی مزعومہ حکومت الٰہیہ قائم ہو ہی جاتی اور فرشتوں کو آں موصوف اور انکی کمیٹی کیلئے سازگاری کی نوبت آجاتی تو شاید آسمانی فرشتے علامہ کے ساتھ اپنا "تال میل" قائم بھی تو نہ رکھ سکتے آپ ذرا خود ہی غور فرمالیں کیا آپ کو یقین ہے کہ علامہ نے "فاطمہ جناح" کے مسئلہ میں جو دلچسپی لی تھی "آسمانی فرشتے" بھی ان کی سرگرمیاں یونہی دم بخود دیکھتے رہے ؟

مسجودیت یعنی تسخیر و انقیاد کا یہ اعزاز بھی مخصوص طور پر حضرت آدمؑ کے لئے نہ تھا

علامہ کے مندرجہ بالا حاشیۂ تفہیم سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اس تسخیر و انقیاد اور "سازگاری کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے پہلے پیغمبر اور پہلے شاگرد نیز جملہ ملائکہ کے پہلے استاد حضرت آدم کے مظاہرۂ علمی کے انعام کے طور پر محض ان کی ذات کیلئے خاص نہ تھا بلکہ یہ اعزاز "سجدہ" (جسے سازگاری ہی کہا جائے) حضرت آدم کے ضمن میں پائے جانے والے "ضمنی انسان" کے لئے تھا موصوف کے نزدیک شاید حضرت آدم کا تعلق اس قصہ سے اتنا ہی ہے کہ وہ اس "ضمنی انسان" کے باپ تھے۔ ع۔ ہم اسلئے بات الٹی، یار الٹا۔

اگر آپ کا حسن ظن علامہ کیخلاف ایسے گمان کی اجازت نہ دیتا ہو ——— تو

براہ کرم اسی مذکورہ بالا حاشیۂ تفہیم کے مندرجہ ذیل دو فقرے دوبارہ بغور و خوض ملاحظہ فرمائیں۔

(الف) "فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو" جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں" استعمال کرنا چاہے تو ——— تمھارا فرض ہے" تمھیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی"

(ب) "وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے ——— دونوں

صورتوں میں جب ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمھیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی"

خدارا انصاف سے بتائیے کہ

حضرت آدم علیہ السلام کی شان علم کے "بین المخلوقاتی" مظاہرہ پر فرشتوں کو انکے لئے جو "سربسجود" ہونے کا حکم دیا گیا تھا اس حکم کی تعبیر کے لئے علامہ کی دوراز کار خامہ فرسائی نامۂ سیاہ کرنے کے علاوہ اور بھی کچھ کہی جا سکتی ہے؟ کوئی بھی صاحب عقل وایمان اس موشگافی کو موزوں ومعقول کہہ سکتا ہے؟

علامہ نے اپنی "عادت قدیمہ" اور "عقیدۂ مستورہ" کے تحت عصمت انبیاء کے مسئلہ مسلمہ کو اپنا ہدف ونشانہ بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔

غور تو فرمائیے کہ

کیا وہ چوری کرنے والا اور بدی کا ارتکاب کرنے والا جسکے لئے فرشتوں کو سازگاری کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، کسی طرح بھی اسکا مصداق حضرت آدم علیہ السلام کی ذات بابرکات بن سکتی ہے؟ (جو خدا تعالیٰ کے سب سے پہلے پیغمبر اور ابوالبشر ہونے کے ساتھ ساتھ ابوالانبیاء بھی ہیں) اگر انکی ذات اسکا مصداق نہیں بن سکتی اور یقیناً نہیں بن سکتی۔ تو پھر مظاہرۂ علمی کے انعام واکرام کے موقع پر فرشتوں سے انھیں سجدہ کرانے کے بجائے ایسی "سازگاری" کا حکم دینا کیا معنی رکھتا ہے؟

علامہ کی یہ تو بڑی زیادتی ہوگی کہ

وہ اپنے "اعمال و افعال" میں فرشتوں کی "سازگاری" کا فائدہ اٹھانے کیلئے حضرت آدم کی مسجودیت ہی سے انکار کر بیٹھیں اور سجدہ کی ایسی انوکھی تشریح فرما ڈالیں کہ حضرت آدم (جو اصل مسجود لہ ہیں) اس کرامۃ عظیمہ اور "فضیلت خاصہ" سے بالکل ہی محروم ہو کر رہ جائیں۔

کوئی غیر ابنائے جنس از قسم جن وغیرہ اگر جنسی و نوعی تعصب میں حضرت آدم علیہ السلام کو اسطرح نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا تو کر سکتا تھا مگر آدم کے کسی بیٹے کی اس سے بڑھکر ناخلفی کیا ہوگی کہ وہ اپنے "باوا" کو ملنے والے اعزاز و اکرام سے اسکو محروم کرکے اس اعزاز کو اپنے حق میں خاص کرنے کی کوشش کرے۔

ایک ارشاد میں دو گمراہیاں

حاشیۂ تفہیم کے منقولہ اقتباس میں علامہ کا یہ ارشاد (جب تک ہم اسے اسکی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمھیں اسکے لئے سازگاری کرنی ہوگی) اپنے اندر دو گمراہیاں لئے ہوئے ہے، ایک طرف تو علامہ (شاید بغیر سوچے سمجھے ہی) اپنے صحیح یا غلط "نیکی" و "بدی" ہر کام کو خدا تعالیٰ کے اذن و اجازت پر مبنی قرار دے رہے ہیں جو ایسی زبردست فکری گمراہی ہے کہ کوئی صحیح العقیدہ و سلیم العقل اسے اپنے حلق کے نیچے نہ اتار سکے گا کیونکہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ جب خود ہی کسی غلط کام یا بدی کا اذن دے رہے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس پر گرفت و مواخذہ ہی کیوں فرمائیں گے ؟

پائے استدلالیاں چوبیں بود   پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

دوسری طرف علامہ نے اپنے صحیح یا غلط ہر کام میں فرشتوں کو بھی اپنی سازش کا شکار اور بقول خود ساز گار بنا کر "عصمت ملائکہ" کو بھی دغدار بنانے کی اذیت ناک کوشش فرمائی ہے فالی اللہ المشتکی عما یصفون۔

کجا آں شورہ شوری کجا ایں بے نمکی

کہاں تو علامہ نے اپنے دیباچہ میں سابق مترجمین و مفسرین کی تمام تر مساعی پر یوں خط نسخ و بطلان کھینچا تھا کہ پڑھنے والا بری طرح مرعوب ہو کر پوری طرح علامہ کا معتقد ہو جائے کہ واقعی اس دور پرفتن و سرا پا ضلال میں علامہ سے بڑھکر کوئی فہامہ قرآن شاید ہی پیدا ہوا ہو اور کہاں علامہ کا تفسیر نگاری میں اب یہ حال ہے کہ وہ آیت بالا کا کوئی یقینی اور متعین مفہوم اپنے ناظرین کو بتانے سے قاصر و عاجز بھی نظر آرہے ہیں۔ حاشیہ بالا کے خط کشیدہ آخری فقروں پر غور فرمایا جائے تو یہ بات بھی صاف نظر آجاتی ہے کہ علامہ کو اس آیت کے کسی متعین مفہوم کا یقین بھی نہیں محض ظن و تخمین سے اٹکل پچو اندھیرے میں تیر مار رہے ہیں واہ کیسے زبردست مفسر ہیں کہ محض "طبع زاد" احتمالات کے بل بوتے پر تفسیر رقم فرما رہے ہیں سہ

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا   لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

"حکم سجدہ" کا مفہوم و مطلب متعین کرنے میں علامہ کے یہ تردد آمیز وارتیاب خیز فقرے (کہ (۱) "اسکی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی" (۲) "ممکن ہے صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو" (۳) "مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی "علامت" کے طور پر

کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو) پڑھکر انکا ناظر کی "تفسیر دانی" کی تعریف و تحسین کریگا یا پھر مجبوراً موصوف کی "سرمایہ تفسیر" سے تہی دامنی پر نوحہ و ماتم کرے گا؟ اسکا فیصلہ ہم اپنے ناظرین کے جذبہ عدل و انصاف پر ہی چھوڑتے ہیں۔

علامہ کی پیش بندی اور عبارت کی معذرت شاید اسی لئے رہی ہو گی

بات بہت دور پہونچگئی گذشتہ صفحات میں دیباچہ تفہیم ص۱۱ کا ایک اقتباس ہم پیش کر آئے ہیں جس میں علامہ نے بڑی ہی معصومیت کے ساتھ "آزاد ترجمانی" کے نام پر ترجمہ قرآن مجید کے دوران مکمل "آزادی" بلکہ گمراہی تک کیلئے راہ ہموار کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اقتباس مذکورہ بالا پر آپ دوبارہ پھر نظر ڈالیں یہ آیت زیر بحث در اصل اسی اقتباس کے تجزیہ و تحلیل کے سلسلہ میں یہاں پیش کیگئی ہے

آیت مذکورہ بالا (وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط) کا جو ترجمہ علامہ نے فرمایا ہے وہ بھی آپ نے ملاحظہ فرمالیا اور دوسرے حضرات مترجمین و مفسرین کے سات مختلف تراجم بھی آپ کے ملاحظہ میں آگئے اب یہ فیصلہ صرف آپ ہی کو فرمانا ہے کہ اس اقتباس میں علامہ نے اپنے خوف و خشیت اور حذر و احتیاط کی تصویر کشی میں جس مبالغہ کا اظہار فرماتے ہوئے یہ چند جملے تحریر فرمائے تھے

("کہ بہت ڈرتے ڈرتے یہ آزادی برتی ہے، جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے، قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادی زبان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے")

عملی طور پر وہ خوف خشیت اثنائے ترجمانی کس بری طرح مفقود ہے۔ علامہ نے
انسانوں کی بدکرداری میں فرشتوں کی "سازگاری" اور خود ذات باری تعالیٰ کے
"اذن" و اجازت کو بھی اسکا سہارا اور مبنیٰ قرار دیکر ساری بدکرداریوں کی ذمہ داری
جس حسین انداز میں خدا تعالیٰ کیطرف منتقل کرنی چاہی ہے اسکو دیکھکر یہ یقین کرنا بھی
مشکل ہے کہ ایسے شخص کے دل و دماغ پر خدا کے خوف و خشیت کی کوئی پرچھائیں
بھی پڑی ہوگی مگر لطف یہ ہے کہ موصوف نے اپنے خوف و خشیت کی "بقلم خود" جو
تصویر کشی فرمائی ہے وہ ایسے فنکارانہ انداز میں فرمائی ہے کہ اب کسی کو یہ مجال
بھی تو نہیں ہے کہ انکے خوف و خشیت پر شک وارتیاب کی نظر بھی ڈال سکے اور
ہمت کرکے ان سے یہ دریافت کرنے کی جسارت بھی کرلے کہ جناب والا آیت مذکورہ
میں سجدہ کا مشہور و متعارف ترجمہ و مفہوم چھوڑکر فرشتوں کی سازگاری کی یہ
آزاد ترجمانی اختیار کرنے سے پہلے جناب پر خوف و خشیت کے کتنے دورے
پڑے تھے اور کتنے ڈرتے ڈرتے جناب نے یہ آزادی برتی ہے؟

ہمارے اس سوال کا جواب اگر "نفی" میں ہوا ور یقیناً نفی ہی میں ہوگا
تو براہ کرم ہمیں بتایا جائے کہ اس قسم کے مصنوعی خوف و خشیت کی "نمائش محض" کو
جناب کے تعبیر کردہ "دارالاسلام" میں بھی کیا ریاکاری ہی کہاجاتا ہے یا وہاں اس کا
کوئی اور نام ہے؟ صرف اپنی واقفیت اور آگاہی کیلئے جواب درکار ہے۔
گذشتہ صفحات میں راقم السطور نے تفہیم کے دیباچہ سے متعلق دو مزید اقتباسات پر
تبصرہ کا ذکر کیا تھا جن میں سے ایک اقتباس پر یہ تبصرہ ابتک چلتا رہا۔

اقتباس مذکورۂ سابق تو علامہ کی آزاد ترجمانی کی وضاحت و معذرت

سے متعلق تھا اب دیباچہ کا وہ باقیماندہ دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو جسے علامہ نے ہر سورۂ قرآن سے متعلق اپنے تحریر فرمودہ دیباچوں اور آیات قرآنیہ سے متعلق تشریحی حاشیوں کے سلسلہ میں اپنے منصوبہ کی وضاحت کے طور پر سپرد قلم فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :۔

اقتباس دوم

(الف) "میں نے ہر سورہ کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھدیا ہے جس میں اپنی حد تک پوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سورہ کس زمانہ میں نازل ہوئی، اسوقت کیا حالات تھے اسلام کی تحریک کس مرحلہ میں تھی، کیا اسکی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اسوقت درپیش تھے، نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعہ آیات کی کوئی الگ شان نزول ہے وہاں اسے میں نے حاشیہ میں بیان کر دیا ہے"

(ب) "حواشی" میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے بھی حاشیے میں نے لکھے ہیں دو ہی قسم کے مقامات پر لکھے ہیں ایک وہ جہاں محسوس ہوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا یا اسکے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوگا یا وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ

ہوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گذر جائے گا اور قرآن کے ارشاد کی اصل روح اس پر واضح نہ ہوگی" (دیباچہ تفہیم ص۱۱)

اقتباس بالا میں علامہ نے اپنی تفسیر نویسی سے متعلق پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے خصوصی طور پر دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں:۔

۱۔ (شق الف) میں علامہ نے ارشادات قرآنی کو پوری طرح سمجھنے کیلئے ہر سورہ کے آغاز میں ایک ایسے دیباچہ کی ضرورت ظاہر فرمائی ہے جس میں موصوف (اس سورہ کے شروع میں اسکی شان نزول پر داد تحقیق دیں گے۔

۲۔ (شق ب) علامہ نے اپنے "تفسیری حواشی" سے متعلق کچھ وضاحت و صفائی پیش فرمائی ہے

راقم السطور کو آئندہ سطور میں اقتباس ہذا کے انہی دو پہلوؤں پر اپنی معروضات پیش کرنی ہیں اور یہ دکھلانا ہے کہ علامہ کا اصل فن اور کمال صحافت (جسکا شجرۂ نسب شاید مغالطہ و فریب سے ہی جا ملتا ہے) یہی ہے کہ موصوف نے اپنے اسی دیباچہ و مقدمہ میں (جو نظر بظاہر بالکل بے غبار اور بے ضرر لگتے ہیں) اپنی تحریک کو ناظرین کے دل و دماغ میں بٹھا دینے کیلئے کس خوبی سے زمین ہموار فرمائی ہے اور کیسے حسین و لطیف اور پر حکمت (اور فنکارانہ انداز میں تفہیم القرآن کی زہرناکیوں اور خطرناکیوں کو قبول کر لینے کیلئے ناظرین کی "ذہن سازی" کا حق ادا فرمایا ہے۔

ہر سورۃ کے آغاز میں علامہ نے سورتوں کی شان نزول پر جو داد تحقیق دی ہے ان پر تفصیلی کلام تو اسی وقت مناسب ہوگا جب ہم تفہیم القرآن کی ان حدود میں داخل ہوکر تبصرہ کریں گے۔

Scanned with CamScanner

اسی طرح تفہیم کے "تفسیری حاشیوں" پر تبصرہ بھی برمحل ہی مناسب ہوگا لیکن ناظرین تبصرہ کے انتظار کو کسی قدر کم کرنے کیلئے ان دو پہلوؤں سے متعلق دو ایک مثالیں اس موقع پر بھی پیش کیجا رہی ہیں۔

شان نزول سے متعلق

علامہ کے متعلق زیر نظر تبصرہ میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ موصوف اپنی اس تفسیر نویسی میں اپنے آپ کو کسی روایت حدیث یا قول مفسر کے حوالہ کا پابند نہیں تصور فرماتے جسکی وجہ غالباً یہی ہے کہ آں موصوف کو جتنا کچھ اعتماد اپنی عقل و رائے پر ہے اتنا اعتماد انھیں روایات و اقوال پر نہیں ہے جیسا کہ تنقیحات کے حوالہ سے موصوف کا ایک ارشاد بھی صفحات گذشتہ میں نقل کیا جا چکا ہے جسمیں موصوف نے کتب تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں کو ناکافی بلکہ بیکار قرار دیا ہے اور ایک دوسرے مقام پر قرآن فہمی کی صلاحیت "علمائے کرام" سے سلب فرماتے ہوئے صرف کالج کے "پروفیسر" ہی میں تسلیم فرمائی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موصوف ہر معاملہ میں نقل روایات کو یکسر متروک فرماتے ہوئے اپنی عقلی اور طبعزاد توجیہات سے زیادہ کام نکالنا چاہتے ہیں چنانچہ ہر سورہ سے متعلق دیباچہ میں اسکی شان نزول سے متعلق جو کلام فرمایا ہے اسمیں بھی "روایات" کا ذکر بہت ہی کم ہے اور اگر کسی مقام پر مظاہرۂ علم و مطالعہ کے تحت روایات ذکر بھی فرمائی ہیں تو آخر میں اپنی عقلی تیغ کے ذریعہ ان روایات کو کالعدم فرمایا ہے مثال کیلئے تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۵۴۶ پر معوذتین (الفلق، الناس)

کا دیباچہ ملاحظہ ہو" زمانۂ نزول" پر کلام فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

(الف) " حضرت حسن بصری[1]، عکرمہ، عطار اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایک روایت یہی ہے مگر[2] ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہیں اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیر اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہونچاتی ہیں ان میں سے ایک مسلم، ترمذی نسائی اور مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عقبہ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا الم تر ایاتٍ انزلت اللیلۃ لم یر مثلھن اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (تمہیں کچھ پتہ ہے کہ آج کی رات مجھ پر کیسی آیات نازل ہوئیں یہ بے مثل آیات ہیں اعوذ برب الفلق اعوذ برب الناس) یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر ہجرت کے بعد" مدینہ طیبہ" میں ایمان لائے تھے جیسا کہ ابو داؤد اور نسائی نے خود ان کے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس (مدنی ہونے کے) قول کی موجب بنی ہیں وہ ابن سعد محی السنۃ بغوی، امام نسفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ بدرالدین عینی، عبد بن حمید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینہ میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

بیمار ہو گئے تھے اسوقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں ابن سعد نے
واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ ۴ھ کا واقعہ ہے اسی بنا ر
پر سفیان بن عیینیہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے "
(تفہیم القرآن جلد ششم ۵۴۶)

نقل کے بعد عقل

معوذتین کے شان نزول سے متعلق مندرجہ بالا روایات نقل فرمانے کے
بعد علامہ نے "عقل شریف" کا بھی استعمال فرمایا ہے چنانچہ متصلاً اگلے ہی پیرا میں
ارشاد فرماتے ہیں۔

(ب) " لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچہ میں بیان کر چکے
ہیں کسی سورۃ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع
پر نازل ہوئی تھی تو اسکا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ
اسی موقع پر نازل ہوئی تھی بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک
سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی تھی اور پھر کوئی واقعہ یا صورت حال
پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کیطرف سے اسی کی طرف دوبارہ بلکہ بار بار
حضورؐ کو توجہ دلائی جاتی تھی ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ معوذتین
کا بھی ہے انکا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اسوقت
نازل ہوئی ہونگی جب وہاں حضورؐ کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی
بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین، یہود اور مشرکین کی مخالفت کے

کے طوفان اٹھے تو حضور کو پھر ان ہی دونوں سورتوں کے پڑھنے
کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر کی مندرجہ بالا روایت میں
ذکر آیا ہے۔ اسکے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی
علالت مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام
نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی"۔ (حوالہ بالا)

(ج) "اسلئے ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ
معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ
کے ساتھ انکو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اس کے ساتھ
صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ
ہی تعلق رکھتی ہے سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورہ الناس
کا اس معاملہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے"
(تفہیم القرآن جلد ششم ص۵۴۶)

صحافتی چابکدستی اور شوق معقول پسندی

معوذتین کے دیباچہ سے یہ طول طویل اقتباس جسے ہم نے تبصرہ میں
سہولت کے خیال سے (الف، تا، جیم) تینوں حصوں میں اوپر نقل کیا ہے
سطور ذیل میں بطور تجزیہ ان پر اپنا تبصرہ پیش کیا جا رہا ہے:۔

(شق الف) ملاحظہ ہو علامہ نے کس ہوشیاری اور چابکدستی
سے مظاہرۂ علم و نمائشِ مطالعہ فرماتے ہوئے حضرات ابن عباس، حسن بصری

عکرمہ، جابر بن زید، عطا رضی اللہ عنہم اور حضرات عبداللہ بن زبیر و قتادہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کے اسمائے گرامی بھی ذکر فرما دیئے اور متعدد کتب حدیث کی روایات کا بھی حوالہ دیتے ہوئے ناظرین کو "دو تاثرات" دینے کی کوشش فرما گئے۔

پہلا تاثر تو یہ ہے کہ "معوذتین" کو مکی کہنے والے حضرات تعداد میں زیادہ ہیں یعنی حضرت حسن بصری، عکرمہ، عطا اور جابر بن زید اور ایک روایت کے مطابق حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ اسطرح اس روایت کو پانچ مفسرین کی تائید حاصل ہے۔ اور اس روایت کے برخلاف معوذتین کو "مدنی" کہنے والے حضرات صرف ڈھائی ہیں یعنی ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انکے علاوہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما۔

دوسرا تاثر یہ کہ "معوذتین" کے شان نزول کا مسئلہ بغیر کسی فیصلہ کے ابتک یونہی پڑا ہوا تھا مذکورہ بالا ہر دو اقوال میں سے کسی قول کو اختیار و ترجیح کی نوبت ہی نہ آسکی تھی جسکی وجہ سے علامہ کو یہ اہم "خدمت فیصلہ" انجام دینا پڑی جو اقتباس بالا کے شق جیم میں اوپر نقل ہوئی۔ علامہ کا یہ فیصلہ کس حد تک معقول ہے اس پر اپنا تبصرہ تو ہم آئندہ پیش کریں گے سردست مندرجہ بالا ہر دو تاثرات کی حقیقت ملاحظہ فرمائی جائے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا علامہ کی نقل کے مطابق "معوذتین" کو "مکی" قرار دینے والے حضرات تعداد میں زیادہ دکھائے گئے ہیں اور مدنی کہنے والے صرف ڈھائی ہی ہو پاتے ہیں لیکن جب ہم کتب تفسیر کے ان ذخیروں کو دیکھتے ہیں (جنھیں دیکھنے سے علامہ نے شاید اسی روز کے لئے بریک لگانا چاہا تھا) تو ہمیں کتب تفسیر میں مندرجہ ذیل تصریحات ملتی ہیں:۔

(۱) علامہ محمد بن یعقوب فیروزآبادی تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو کچھ روایت فرماتے ہیں اسے ہم مختصراً نقل کرتے ہیں

(الف) الفلق وھی کلھا مکیہ وقیل مدینہ سورۂ فلق کے بارے میں دونوں ہی قول کہ "مکی" ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ "مدنی" ہے۔

(ب) وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (کی تفسیر میں) لبید بن الاعصم الیھودی اذ حسد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسحرہٗ (یعنی حاسد سے مراد لبید بن اعصم یہودی ہے جب اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد کیا اور آپ پر جادو کیا)

(ج) الناس وھی کلھا مدینہ سورۂ ناس کے بارے میں صرف ایک قول کہ مدنی ہے۔

(د) (سورۂ ناس کے ختم پر یہ عبارت ہے) نزلت ھاتا السورتان فی شان لبید بن الاعصم الذ سحر النبی یہ دونوں سورتیں لبید بن اعصم کے واقعہ میں نازل ہوئیں جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا ___ فقرأ النبی صلی اللہ علیہ و سلم علی سحرہ ففرج اللہ عنہ فکانما نشط من عقال (تنویر المقیاس ص ۳۹۸ مطبوعہ مصر مع لباب النقول) تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسکے جادو پر پڑھیں اللہ تعالیٰ نے جادو زائل فرما دیا اور آپ یوں ہو گئے جیسے کوئی بندھن رہا ہو اس سے کھول دیئے گئے ہوں

(۲) علامہ قمی نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں مختلف اقوال نقل

فرمانے کے بعد آخر میں بحث کا خاتمہ اس طرح فرماتے ہیں :-

وقال جمهور المفسرين ان لبيد بن الاعصم اليهودي سحر النبي صلى الله عليه وسلم في احدى عشرة عقدة في وتر ودسه في بئر ذي اروان فمرض النبي صلى الله عليه وسلم واشتد ذالك عليه ثلاث ليال نتزلت معوذتان (تفسیر غرائب القرآن ص۱۹۴ برحاشیہ طبری جلد آخر)

جمہور مفسرین نے فرمایا کہ لبید بن عاصم یہودی نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا ایک تانت میں گیارہ گرہیں ڈالکر ذی اروان نامی کنوئیں میں چھپا دیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور وہ مرض تین دن رات تک بہت سخت ہو گیا تو معوذتین نازل ہوئیں

(۳) علامہ رازی کی تفسیر کبیر میں بھی تقریباً یہی مندرجہ بالا عبارت موجود ہے علامہ موصوف بھی جمہور مفسرین کا قول یہی نقل فرما رہے ہیں جو اوپر نقل ہوا (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد آخر ص۵۳۹)

(۴) علامہ ابوالسعود کی تفسیر ابی السعود میں بھی یہی شان نزول اختیار کیا گیا ہے اور واقعہ سحر کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر ابی السعود برحاشیہ تفسیر کبیر (ص۵۴۴ جلد آخر)

(۵) علامہ سیوطی نے اپنی مشہور کتاب لباب المنقول فی اسباب النزول میں بھی شان نزول کے سلسلہ میں پہلے تو یہی روایت مذکورہ بالا قدرے اختلاف و قدرے تفصیل کے ساتھ بیہقی کی " دلائل النبوۃ " سے نقل فرمائی ہے بعد میں

ابونعیم کی تخریج کردہ دوسری روایت بھی نقل کی ہے مگر اسکا تعلق بھی یہودی سے ہے اسلئے ہر دو روایات سے معوذتین کا مدنی ہونا ہی ثابت ہوتا ہے (ملاحظہ لباب المنقول ص۳۰۶ برحاشیہ تفسیر ابن عباس)

(۶) علامہ جلال الدین محلی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "سورۃ الفلق مکیۃ اومدنیۃ" سورۂ فلق مکی ہے یا مدنی ہے۔ پھر شان نزول میں اپنی مشہور روایت نقل فرماتے ہیں:۔

نزلت هذه السورة والتي بعدها لما سحر لبيد اليهودي النبي صلى الله عليه وسلم في وتر به احدى عشرة عقدة فاعلمه الله بذالك وبمحله فاحضر بين يديه صلى الله عليه وسلم وامر بالتعوذ بالسورتين الخ (جلالين شريف ص۵۰۸) یہ سورۃ اور اسکے بعد کی سورہ اسوقت نازل ہوئی جب لبید یہودی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کر دیا تھا ایک تانت میں جس میں گیارہ گرہیں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع فرما دیا اور اسکی جگہ بھی بتادی چنانچہ وہ تانت آپ کے سامنے پیش کی گئی اور آپ کو ان دونوں سورتوں سے تعوذ کا حکم فرمایا گیا۔

(۷) علامہ سلیمان جمل تفسیر جلالین کے محشی فرماتے ہیں:۔

یہ سورۃ مکی ہے حضرات حسن، عطا اور عکرمہ کے قول کے مطابق۔ اور یہ سورۃ مدنی ہے حضرت عبداللہ بن عباس حضرت قتادہ اور ایک جماعت کے قول کے مطابق جسکی تائید شان نزول سے بھی

ہوتی ہے (جمل ص۶۰۷ جلد ۴)

(۸) علامہ ابن قیم علیہ الرحمہ بھی "تفسیر المعوذتین" میں اپنی تفسیر حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اسی روایت سے شروع فرما رہے ہیں جسے علامہ نے بھی اپنے دیباچہ میں نقل فرمایا ہے (جیسا کہ اقتباس بالا میں مسطور ہو چکا) اور جسکی بنیاد پر معوذتین کا مدنی ہونا بھی تسلیم فرمایا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر المعوذتین لابن قیم ص۲ مطبوعہ مصر)۔

(۹) شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی اپنی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں

(الف) سورۃ الفلق یہ سورہ مدنی ہے۔

(ب) سورۃ الناس یہ سورہ مدنی ہے۔

(ج) ان دونوں سورتوں کے نازل ہونے کا سبب یہ ہے کہ لبید بن عاصم یہودی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسکے جادو کے سبب سے بیمار ہو گئے تھے (پوری روایت نقل فرمانے کے بعد) اور جبرئیل علیہ السلام یہ دونوں سورتیں لیکر نازل ہوئے (تفسیر عزیزی اردو ص۲۳۶ مطبوعہ انتظامی)

(۱۰) مفسر حقانی اپنی تفسیر حقانی میں فرماتے ہیں :۔

حسن بصری، عکرمہ، عطاء و جابر کہتے ہیں کہ یہ سورۃ بھی مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت ابن عباس وغیرہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ مدینہ میں نازل ہوئی اور قول یہی قوی تر ہے (تفسیر حقانی ص۲۷۰ پارۂ عم)

(۱۱) حضرت حکیم الامۃ تھانوی علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں

Scanned with CamScanner

یہی مشہور شانِ نزول اختیار فرمایا ہے کہ:۔

لبید نے جادو کیا تھا، سورۂ فلق اور ناس ایک ساتھ نازل ہوئیں حسب دلائل بیہقی سبب نزول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید یہودی اور اسکی بیٹیوں نے سحر کر دیا تھا (مختصراً) خلاصہ تفسیر بیان القرآن بر حاشیہ حمائل شریف اشرفی۔ (ادارہ اشاعت دینیات نظام الدین دہلی)۔

(۱۲) علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمہ اپنے تفسیری حاشیہ میں تنبیہ کے زیر عنوان فرماتے ہیں:۔

کئی صحابہ (مثلاً عائشہ صدیقہ، ابن عباس، زید بن ارقم رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض یہود نے سحر کیا اسکے علاج کے واسطے اللہ تعالےٰ نے یہ دو سورتیں نازل فرمائیں اور انکی تاثیر سے وہ اثر باذن اللہ زائل ہو گیا۔

واضح رہے کہ یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے جس پر آجتک کسی محدث نے جرح نہیں کی (حاشیہ عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند)

(۱۳) معجز نما حمائل شریف (شائع کردہ نور محمد تاجر کتب جامع مسجد دہلی مطبوعہ ۱۹۲۸ء) کے حاشیہ پر مختلف کتب تفسیر کے حوالہ سے یہ شان نزول درج ہے مختصراً نقل کیجاتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

شان نزول مسند ابن حمید وغیرہ میں جو روایتیں ہیں انکا حاصل یہ ہے کہ لبید بن الاعصم ایک شخص یہودی نے۔۔۔ الی

آخر الروایۃ (حوالہ میں تفسیر ابن کثیر و خازن اور فتح البیان کے نام تحریر ہیں)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں

علامہ کی شان تحقیق اچھی طرح بے نقاب ہو گئی کہ شق "الف و با" میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکا کتنا حصہ منقول ہے۔ کتب تفسیر کے جو حوالے منقول ہوئے ان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ :۔

(الف) "معوذتین" کے بارے میں قول مشہور اور قول جمہور اور قول مستند و معتبر یہی ہے کہ یہ سورتیں مدنی ہیں۔

(ب) شان نزول میں کچھ اختلاف کے باوجود یہ بات تو تقریباً مسلّم و متفق ہی سی رہی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا جس کے دفع و علاج کے لئے یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ (سحر کرنے والے کی ذات میں قدرے اختلاف ہے)

(ج) علامہ کے سوا مندرجہ حضرات مفسرین میں سے کسی نے بھی " معوذتین " کے سلسلہ میں تکرار نزول اور تعداد نزول کی بات نہیں فرمائی پھر علامہ تو ترقی فرماکر معوذتین کا نزول تین بار قرار دے رہے ہیں ایک بار مکہ شریف میں اور دو بار مدینہ شریف میں جن میں سے پہلی بار (جسکا ذکر حضرت عقبہ بن عامر کی روایت سے تسلیم کیا ہے) کا نزول واقعہ سحر سے پہلے قرار دے رہے ہیں اور دوسری بار کا نزول واقعہ سحر ہی سے متعلق گردان رہے ہیں۔ اس طرح معوذتین کے کل نزول تین بار ہو جاتے ہیں جسکی کوئی دلیل نقلی علامہ کے پاس نہیں ہے نہ انھوں نے ہی اپنے دعوی پر کوئی دلیل دی

Scanned with CamScanner

نہ مندرجہ بالا کتب تفسیر سے انکے قول کو ادنیٰ سا سہارا مل سکا۔

عقل کی لنگڑی دلیل

ہاں علامہ نے اس موقع پر اپنے "انوکھے دعوی" کو بزعم خود معقول بنانے کی خاطر اپنی عقل کا بھی استعمال فرما ڈالا ہے (ملاحظہ ہو اقتباس بالا کی شق ج) فرماتے ہیں جادو کے معاملہ کے ساتھ انکو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ اس کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت ہی تعلق رکھتی ہے۔ سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۃ الناس کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے (تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۵۴۷)

شاید علامہ یہ فرمانا چاہتے ہوں گے کہ

"معوذتین" کی شان نزول سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسحوریت اور "سحر زدگی کی جو روایات صحیحین وغیر صحیحین میں موجود ہیں وہ سب بالکل غیر معقول اور ناقابل قبول ہیں ان سورتوں کو جادو کے معاملہ کے ساتھ وابستہ قرار دینے میں یہ دشواری ہے کہ دونوں سورتوں کی مجموعی آیات گیارہ ہیں جن میں جادو کا تعلق صرف ایک ہی آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ سے ہے بقیہ دس آیات کا جادو کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس منطق کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے جو علامہ نے "شق جیم" کے ابتدائی حصہ ہی میں فرما دیا ہے کہ ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے

ہیں یعنی صحیحین کی روایات سے کچھ ثابت ہو جمہور مفسرین کچھ فرماتے ہوں علامہ اسے تسلیم کرنے کیلئے صرف اسوجہ سے تیار نہیں ہیں کہ وہ انکی عقل شریف کے مطابق نہیں ہے۔ انکی عقل تو یہ کہتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو "رد سحر" کے لئے نازل ہی فرمانا تھا تو صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ نازل فرما دیتے اکدم سے گیارہ آیات پر مشتمل دو سورتیں ایک ساتھ نازل کرنے کا کیا تک کیونکہ دوسری آیات کو تو جادو کے معاملہ کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

بات اور مضحکہ خیز ہو سکتی ہے

اگر کوئی صاحب یہ خیال فرماتے ہوں کہ وہ علامہ کو قائل کرنے کے لئے یہ معقول دلیل دے سکتے ہیں کہ واقعہ سحر میں چونکہ گیارہ گرہیں لگائی گئی تھیں اسلئے گیارہ آیات کا نزول ہوا۔ لیکن ہمارا خیال ہے علامہ اتنی آسانی سے قابو میں آسکیں گے ہو سکتا ہے وہ یہ بھی فرما دیں کہ معاملہ سے غیر متعلق آیات نازل فرمانے کے مقابلہ میں تو یہ صورت زیادہ معقول ہوتی کہ صرف ایک آیت ہی نازل ہوئی ہوتی اور بذریعہ وحی جہاں اور تفصیلات سے آگاہ فرمایا گیا تھا یہ ہدایت بھی مل جاتی کہ تانت پر گیارہ گرہیں لگی ہیں لہٰذا اس کو گیارہ بار پڑھا جائے۔ اس طرح بات علامہ کی عقل شریف کے بالکل مطابق ہو جاتی۔

اگر ذرا بھی غور سے کام لیا جائے

تو علامہ کی ساری تحقیقات پڑھکر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ موصوف

کے نزدیک جب معوذتین کا مکی ہونا ہی زیادہ معتبر تھا اور مجموعہ آیات کا جادو کے معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق بھی نہ تھا تو علامہ کے نزدیک سیدھا سیدھا راستہ یہ تھا کہ وہ معوذتین کے بارے میں ان مفسرین کا قول ابتداءً ہی قبول فرما لیتے جو انھیں مکی قرار دیتے ہیں، بات کو بے وجہ معقول اسطرح طول دینا اور نزول کو بغیر کسی دلیل کے تین بار مکرر ماننا کیا معنی رکھتا ہے؟ علامہ کا مدعا تو مکہ کے پہلے ہی نزول سے حاصل ہو سکتا تھا۔

آخر علامہ نے تفہیم القرآن تو صرف عام مسلمانوں کی قرآن فہمی کے لئے لکھی ہے اور یہ غرض صرف اتنی بات سے پوری ہو سکتی تھی کہ "ان سورتوں کے بارے میں اختلاف ہے کچھ لوگ مکی کہتے ہیں کچھ مدنی کہتے ہیں روایات تو زیادہ تر اس بات کے ثبوت میں ہیں کہ یہ سورتیں مدنی ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں جادو کے معاملہ کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں یہ امر بھی مانع ہے کہ اس کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت ہی تعلق رکھتی ہے" اس مختصر راستہ کو چھوڑ کر روایات حدیث اور اقوال مفسرین کے نقل میں بے ضرورت خامہ فرسائی مظاہرۂ علم نہیں تو اور کیا ہے؟

معجزات وخوارق سے چشم پوشی

گذشتہ صفحات میں کہیں ہم یہ بات اشارۃً کہہ چکے ہیں کہ ہمارے مدیر ترجمان اور ترجمان قرآن علامہ مودودی معجزات خوارق کے معاملہ میں بڑی حد تک تنگ حوصلہ واقع ہوئے ہیں۔ اپنے تفسیری حواشی میں جہاں کہیں انھیں کسی معجزہ سے واسطہ

Scanned with CamScanner

پڑ گیا ہے وہاں موصوف نے جو انداز تحریر اور طرز تعبیر اختیار فرمایا ہے وہ انکی صحافتی چابکدستی کا خاص نمونہ ہے موصوف "بیان خوارق" سے ایسے خوبصورت انداز میں پہلو تہی فرماتے فرماتے ہیں کہ انھیں کوئی بڑے سے بڑا مفتی بھی "منکر خوارق و منکر معجزات" آسانی سے نہ کہہ سکے لیکن وابستگان جماعت (بشمول ہمدردان ومتفقین وارکان) انکی تحریر کے بین السطور کو پڑھکر موصوف کا مدعائے دلی سمجھ لیں اور معجزات وخوارق سے متعلق عقیدت مندی کا جو فرسودہ انداز سلف سے متوارث طور پر چلا آرہا ہے اس سے دستبردار ہوکر خیالات کی اصلاح وتصحیح فرمالیں۔

تفہیم القرآن کے تفصیلی تبصرہ کے وقت انشاء اللہ تعالیٰ حسب موقع ایسے زیغ وضلال کی بھی نشان دہی کیجاتی رہے گی اسوقت تو معوذتین کے اسی دیباچہ زیر بحث سے علامہ کا ایک ارشاد پیش خدمت کیا جارہا ہے :۔

معوذتین کی شان نزول سے متعلق "واقعہ سحر" کی تفصیلات مختلف روایات سے مرتب فرماکر ایک مربوط واقعہ کی شکل میں درج کرتے ہوئے علامہ ارشاد فرماتے ہیں:

" جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپ "معوذتین" پڑھیں (جو علامہ کے نزدیک اسوقت نازل نہیں ہوئی تھیں پہلے ہی نازل ہوچکی تھیں حضرت جبرئیل صرف اسوقت بطور علاج اسکا استعمال بتلانے آئے تھے حالانکہ ہم اوپر جمہور مفسرین کا قول یہ لکھ چکے ہیں کہ جمہور کے نزدیک یہ سورتیں اس وقت پہلی ہی بار نازل ہوئی تھیں)

چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اسکے ساتھ ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک سوئی نکالی جاتی رہی" (تفہیم القرآن

ص۵۵۵ سطر۱۹، ۲۰ جلد۶ مطبوعہ ۱۳۷۴ھ)

ناظرین کرام نے گذشتہ صفحات میں اس واقعہ سحر سے متعلق تقریباً ایک درجن تفاسیر وتراجم کے حوالے ملاحظہ فرمائے ہیں، ان تمام حوالوں کے مطابق جملہ روایات میں " انحلت عقدة " کا لفظ وارد ہوا ہے جس کا مفہوم صرف یہی ہونا چاہیئے (معجزہ ہونے کا یہی تقاضا بھی ہے) کہ وہ گرہیں ایک ایک کر کے ہر آیت پر باذن اللہ خود بخود کھلتی گئیں۔ وہ گرہیں کھولی نہیں گئیں، جیسا کہ علامہ نے تحریر فرمایا ہے۔

علامہ کی مسلمہ صحافت کے پیش نظر یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ موصوف "گرہ کھلنے" اور "گرہ کھولنے" کے مفہوم میں جو فرق ہے اسکی گرہ کشائی نہ فرما سکے ہونگے۔

بہت ممکن ہے کہ

علامہ نے اپنی وسعت مطالعہ کی جو نمائش اور غزارتِ علم کا جو مظاہرہ جگہ جگہ فرمایا ہے اس سے متاثر ہو کر کسی ذہنی غلامی کرنے والے کے دل میں اگر کھٹک پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے علامہ کے پیش نظر کوئی ایسی روایت بھی ہو جسمیں گرہ کھولنے ہی کی تعبیر اختیار کی گئی ہو تو ایسے حضرات کے ذہنی اطمینان کیلئے عرض ہے کہ جی ہاں! یہ امکان مسلم واقعی ممکن ہے کہ کسی روایت میں گرہ کھولنے کی تعبیر بھی موصوف کو مل گئی ہو بلکہ راقم السطور کو پوری صحافتی دیانت کے ساتھ اسکا اظہار بھی کرنے میں تامل نہیں ہے کہ یقیناً علامہ کو بعض روایات ایسی ملی ہونگی جن کے پیش نظر انھیں اپنی "غلط فکر" پیش کرنے کیلئے سہارا مل گیا ہوگا۔

سوال روایات کا نہیں ہے بلکہ سوال تو تحقیق اور معقول بات کا ہے۔ کہاں تو

علامہ معوذتین سے متعلق شان نزول کی روایات کو معقول اور قابل قبول بنانے کے لئے
تین تین بار اسکا نزول فرض کئے لے رہے ہیں جو قطعاً بے دلیل اور بے تک بات ہے
اور کہاں عقل سے یوں دست کش ہوئے جا رہے ہیں کہ بال کی گرہیں کھولنے کا ناممکن
کام انسانی ناخنوں سے انجام دلائے دے رہے ہیں۔

اور وہ بھی ایسی صورت میں کہ عام کتب تفسیر و حدیث میں یہ صراحت کیجا رہی
ہے کہ وہ گرہیں بحکم خداوندی خود بخود کھلتی گئیں۔

معتقدین علامہ کی خدمت میں

علامہ نے اس موقع پر کیا صحافتی فنکاری دکھلائی ہے ہمیں اس سے زیادہ
بحث نہیں کرنی ہے مختصراً یہ اشارات کر دیئے گئے لیکن اپنے ناظرین کے مزید اطمینان کیلئے
ہم وہ بات بھی صاف کئے دیتے ہیں جسے ابتک ہم اشاروں اشاروں میں کہتے آرہے تھے
تفسیر کبیر میں علامہ رازی نے "واقعہ سحر" کے نقل میں جو تعبیر اختیار فرمائی ہے
علامہ نے "مکمل مسامحت" کے ساتھ اسے قبول فرمالیا ہے۔ تفسیر کبیر میں الفاظ یہ ہیں:۔

"قال جبریل للنبی حل عقدة واقراء آیه ففعل و
کان کلما قرأ آیه انحلت عقدة (تفسیر کبیر جلد ۸ ص ۳۹)

حضرت جبرئیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گرہ کھولیئے اور آیت
پڑھیئے تو آپ نے ایسا ہی کیا اور یہی ہوا کہ جب آپ ایک آیت
پڑھتے ایک گرہ کھل جاتی۔

اگر علامہ کو اس عبارت یا ایسی ہی کسی دوسری عبارت سے غلط فہمی ہوئی ہو تو تصحیح فہم

فرمالیں۔ قطع نظر اس سے کہ دوسرے عام مفسرین کی تصریحات اسکے خلاف ہیں خود علامہ کی اپنی یہ عبارت بھی تناقض ہو جائے گی اگر اسے عام مفسرین کی تعبیر کے مطابق نہ سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس عبارت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے حضرت جبریل کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ "حل عقدۃ واقرا ایۃ" یعنی ایک گرہ کھولئے اور ایک آیت پڑھئے جو بظاہر ترتیب واقعہ کے خلاف ہے اصل ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے آیت پڑھی گئی جسکے نتیجہ میں گرہ خود بخود کھلتی گئی اور یہ عمل بالکل ردتھا اصل کیفیت سحر کا۔ سحر کی ترتیب بھی یہی ہوتی ہے کہ کچھ منتر وغیرہ پڑھکر گرہ لگاتے ہوئے اس پر دم کیا جاتا ہے لہٰذا ردسحر میں بھی وہی ترتیب رکھی گئی کہ آیت پڑھتے جائیے گرہ کھلتی جائیگی۔

اسلئے تفسیر کبیر کی عبارت جو اپنے ظاہری مفہوم پر رکھی ہی نہیں جا سکتی علامہ کیلئے کسی طرح مفید مطلب نہ ہو سکے گی:

دوسری دشواری

جو علامہ نے اپنے لئے خود پیدا فرما دی وہ یہ کہ تفسیر کبیر کی مذکورہ بالا عبارات میں گرہ کھولنے کی ہدایت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منقول ہے جسکا تقاضا یہی ہو سکتا ہے کہ اگر گرہ کھولی بھی گئی تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولی ہو گی۔ اس صورت میں جب ہم آپکے ہاتھوں سیکڑوں معجزات کا ظہور تسلیم کرتے ہیں تو ایک یہ معجزہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ آپ نے بال کی گرہیں بھی اپنے ناخن مبارک سے کھول لیں جو کسی دوسرے انسان سے ممکن نہیں ہے لیکن علامہ تو شاید معجزہ کے

تصور ہی گھبراتے ہیں۔ موصوف اِن باتوں کی عقدہ کشائی کبھی معجزہ نبوی کے طور پر
ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں اسی لئے یوں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے تھے اور اسکے ساتھ ایک گرہ
کھولی جاتی"

اس عبارت کا یہ مطلب کہ خود آپ اپنے دست مبارک سے گرہ کھولتے تھے ہم جیسوں
کی سمجھ سے بالاتر بات ہے علامہ کی "امت مسلمہ" جو مطلب چاہے سمجھ لے۔

ناظرین کرام رشتہ مضمون ہاتھ سے نہ جانے دیں

گذشتہ صفحات میں ہم نے "دیباچہ تفہیم" کا دوسرا اقتباس جو پیش کیا تھا
اسکے دو حصے تھے پہلا حصہ علامہ کے ان دیباچوں کی پالیسی سے متعلق تھا جو انھوں
نے ہر سورہ کے آغاز میں شان نزول وغیرہ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔ اس
حصہ الف سے متعلق راقم السطور کی معروضات ملاحظہ میں آچکیں

اقتباس گذشتہ کا دوسرا حصہ علامہ کے ان حواشی کی وضاحت پر
مشتمل تھا جو موصوف نے مختلف آیات پر سپرد قلم فرمائے ہیں اب اس حصہ سے متعلق اپنی
معروضات پیش کیجا رہی ہیں۔ اقتباس بالا میں علامہ نے تحریر فرمایا کہ

"اپنے حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی
بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظرین کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری
چیز کی طرف پھیر دے۔

(ملاحظہ ہو اقتباس بالا)

Scanned with CamScanner

اب ہم چاہتے ہیں کہ

ذرا تفہیم القرآن کے دو ایک حواشی پر نظر ڈال کر دیکھیں تو کہ علامہ کی یہ وضاحت وصفائی مبنی برحقیقت بھی ہے کہ نہیں؟ یا علامہ نے ازراہ دانائی ناظرین تفہیم کو اپنی تفسیر کا شکار بنانے کیلئے اسی قسم کی وضاحتوں ہی کو دانہ ودام بنانے کی کوشش کی ہے۔

صفحات گذشتہ میں قرآن مجید کی سورتوں کے آغاز میں لکھے گئے دیباچوں پر تبصرہ کے لئے بالکل ہی اخیر قرآن مجید کی معوذتین کا دیباچہ بطور مثال پیش کیا گیا تھا اب حواشئ تفہیم کی مثال میں بالکل ہی شروع قرآن مجید یعنی سورۂ بقرہ کی پہلی آیت کے حواشی ملاحظہ ہوں

پہلی مثال

سورۂ بقرکی بالکل ہی پہلی آیت الٓمّٓ پر علامہ کا حاشیہ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:۔

۱ "یہ حروف مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔ جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا خطیب اور شعرا دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اسکی مثالیں ہمیں

ملتی ہیں اس استعمال عام کیوجہ سے یہ مقطعات کوئی پہیلیاں نہ تھے
جس کو بولنے والے کے سوا کوئی سمجھتا نہ ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے
تھے کہ ان سے کیا مراد ہے؟ اور یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ سے بھی
ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا
اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا
لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت
حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص
ان کے معانی نہ جانے گا تو اسکے راہِ راست پانے میں کوئی نقص
رہ جائیگا لہٰذا ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان کی
تحقیق میں سرگرداں ہو۔ (تفہیم القرآن جلد اول ص۴۹)

اس حاشیہ کا تجزیہ بھی ملاحظہ ہو

چونکہ راقم السطور کے تبصرہ کا عنوان ہی ہے "تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش"
اسلئے تبصرہ میں اسکی پوری کوشش کیجارہی ہے کہ ہمارے ناظرین بھی "تفہیم القرآن" کو
اسی بصیرت کے ساتھ سمجھ لیں اسی مقصد کے پیش نظر برابر یہ کوشش رہتی ہے کہ
اپنی کوئی بات گنجلک اور غیر واضح نہ رہنے پائے چنانچہ اسی غرض سے علامہ کے
حاشیۂ بالا کا ضروری تجزیہ پیش کرنے کے بعد ہی اس پہ کوئی تبصرہ ہو سکے گا سیجئے
پہلے تجزیہ ملاحظہ ہو۔

Scanned with CamScanner

علامہ کا مندرجہ بالا حاشیہ چھوٹے چھوٹے متعدد جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر جملہ بجائے خود ایک مستقل دعویٰ ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:۔

پہلا جملہ اس دعوی کو متضمن ہے:۔

(۱) یہ حروف مقطعات (جو) قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں زمانۂ نزولِ قرآن مجید میں جو اسالیب بیان رائج تھے ان میں اس قسم کے مقطعات کا استعمال (شاذ ونادر نہیں) عام طور پر معروف تھا۔

دوسرا جملہ یہ دعویٰ کر رہا ہے اگرچہ یہ دعوی بذات خود مستقل دعویٰ نہیں ہے بلکہ پہلے جملہ کا تکملہ وتتمہ ہی ہے:۔

(۲) اس دور کے خطیب وشعرا دونوں ہی اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔

تیسرا جملہ مدعی ہے کہ:۔

(۳) اسوقت بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں انمیں قرآنی مقطعات جیسی مثالیں ہمیں (علامہ مودودی کو) ملتی ہیں۔

چوتھا جملہ جو من وجہ دعاوی ثلثہ کا نتیجہ بھی ہے لیکن بصورت دعویٰ یوں مذکور ہوا ہے:۔

(۴) اس استعمال عام کیوجہ سے "یہ مقطعات" کوئی "چیستاں" نہ تھے جکو بولنے والے کے سوا کوئی سمجھتا نہ ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے کیا مراد ہے؟

پانچواں جملہ، پانچواں دعویٰ اپنے تہ دامن یوں چھپائے ہوئے ہے۔

(۵) یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان (مقطعات) کے معنی پوچھے ہوں۔

چھٹا جملہ ایک چھٹے دعویٰ پر مشتمل ہے لیکن اس جملہ نے "ترقی صحیح" کی پٹری چھوڑ کر "ترقی معکوس" کی لائن اختیار کر لی ہے۔ اسقدر تیز دوڑنے کے بعد یکدم رجعت قہقری فرماتے ہیں، چھٹا دعویٰ یوں فرمایا جاتا ہے :۔

(۶) بعد میں (مقطعات) کا یہ اسلوب متروک ہوتا چلا گیا۔

"رجعت قہقری" کے عالم میں اگلا اسٹیشن بھی آ گیا ——————— اور ساتویں جملہ میں ساتواں دعوی یوں فرمایا گیا :۔

(۷) اس بنا پر مفسرین کے لئے ان (مقطعات) کے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔

اعتراف شکست کے بعد بھی فوراً سکوت مناسب نہ سمجھا گیا اور اپنے تحقیق پسند طفلک دل کو بہلانے کیلئے دو تین جملے مزید سپرد قلم فرما دیئے گئے ہیں ان جملوں میں "دعوے" کے تیور نہیں ہیں تو ہم بھی انھیں "دعووں" کی فہرست میں شامل نہیں کرتے لیکن تجزیہ کے طور پر انکا اعادہ بھی ضروری ہے۔ اس لئے نمبروار نقل کئے دیتے ہیں۔

(۸) لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف (مقطعات) کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور

(۹) نہ یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان (مقطعات) کے معانی نہ جانے گا تو اسکے "راہ راست" پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا لہٰذا

(۱۰) ایک عام ناظر کیلئے (خود علامہ کے لئے نہیں) کچھ ضروری نہیں کہ وہ ان (مقطعات) کی تحقیق میں سرگرداں ہوں۔

کس قدر خوش فہمی اور کیسی غلط فہمی

علامہ نے اپنے دیباچہ مقدمہ میں جہاں اتنا سب کچھ لکھا تھا اگر وہ یہ بھی وضاحت وصراحت فرما دیتے کہ انھوں نے یہ تفہیم صرف ان حضرات کے لئے تحریر فرمائی ہے جو ہر ایک کی" ذہنی غلامی" سے آزاد ہوکر صرف موصوف ہی کی ذہنی غلامی کو" سند آزادی" تصور کرتے ہوں تو راقم السطور جیسے بہت سے لوگ تفہیم القرآن سمجھنے کی مطلق کوشش نہ کرتے لیکن ایسی صورت میں جبکہ علامہ کیطرف سے بڑی بلند آہنگی سے اس قسم کے دعاوی و اعلانات ہوں گویا موصوف کی یہ تفسیر و تفہیم قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بہت ہی مفید اضافہ ہے جس نے جملہ تفاسیر سابق پر" خط نسخ و بطلان" کھینچ دیا ہے تو ضروری ہوا کہ ان دعاوی کو میزان حقیقت میں تولا بھی جائے اسی سلسلہ میں یہ محسوس ہوا کہ علامہ کو یا تو اپنے متعلق بیحد خوش فہمی ہے یا پھر وہ دوسروں کے متعلق سخت غلط فہمی کا شکار ہیں

ذرا غور تو فرمایا جائے علامہ کی اس سادگی پر

دعوے تو ایک دو نہیں سات سات دعوے لیکن دلیل کسی ایک دعوے پر بھی قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہ فرمائی گئی حالانکہ علامہ کا کوئی دعویٰ بھی ان کی امت کے باہر بغیر دلیل قابل سماعت نہیں ہے۔

(۱) علامہ کا یہ ارشاد کہ جس دور میں قرآن مجید نازل ہو رہا تھا اسوقت مقطعات کے اسلوب میں کلام کرنا عرب میں عام طور پر معروف تھا محتاج دلیل ہے جیسے

قابلِ قبول انداز میں موصوف قیامت تک نہیں پیش کر سکتے۔ راقم السطور کو تھوڑا بہت
جو کچھ بھی علامہ کی فنکاری کو سمجھنے کا موقع مل سکا ہے اسکی بنیاد پر انشاء اللہ تعالےٰ
یہ بات بے بنیاد نہ کہی جاسکے گی کہ علامہ نے سورۂ بقرہ کی پہلی ہی آیت کے پہلے ہی
حاشیہ میں بڑی سخت علمی ٹھوکر کھائی ہے۔ موصوف کا یہ حاشیہ اپنے ناظرین
کے لئے مضحکہ خیزی کا تو موجب ہو سکتا ہے باقی اس سے کسی صاحب علم ناظر کو کوئی
سرمایۂ علم و تحقیق ہاتھ آئے بالکل ناممکن ہے۔

(۲) موصوف کا یہ ارشاد بھی بالکل ہوائی ہے کہ اسوقت خطیب و شعراء دونوں
اس اسلوب سے کام لیتے تھے چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں
ان میں اسکی (ایک دو مثال نہیں بلکہ بہت سی) مثالیں ملتی ہیں۔

ناظرین تفہیم میں سے وہ حضرات جو علامہ کے حلقہ بگوش ہیں وہ تو موصوف
کے یہ فقرے پڑھکر ضرور علامہ کی شان علم پر عش عش کر اٹھیں گے ممکن ہے کچھ
حضرات کو غش پہ غش بھی آنے لگیں لیکن راقم السطور تو اس خالی خولی دعوی سے
ہرگز متاثر و مرعوب نہ ہو سکے گا بلکہ فی الجملہ ادب ہی سے سہی اس دعوے کی
کی مثالوں میں سے دو چار مثالیں اپنی معلومات کے لئے ضرور طلب کرنا چاہے گا
بہتر ہوگا کہ تفہیم کے اگلے ایڈیشن میں اسکی چند مثالیں ضرور پیش فرما دی جائیں۔

ٹپکے گا وہی ظرف سے جو ظرف میں ہوگا

علامہ کے اقتباس مندرجہ بالا میں مقطعات سے متعلق موصوف کا
یہ انداز صفائی کہ یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جن کو بولنے والے (یعنی خدا تعالیٰ) کے

Scanned with CamScanner

سوا کوئی سمجھتا نہ ہو موصوف کے اس جذبہ ادب اور احساس خوف وخشیت کو بیساختہ بالکل غیر شعوری طور پر صفحہ تفسیر پر بے نقاب کئے دے رہا ہے جسکی بڑی خوبصورت تصویر گذشتہ صفحات میں پیش ہو چکی ہے۔

ناظرین اگر غور فرمائیں گے تو شاید یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ موصوف نے مقطعات قرآنیہ پر پھبتیاں کی پھبتی غیر ارادی طور پر محض بے خیالی میں نہیں کہی ہے بلکہ واقعہ یہی ہے کہ جس قسم کی آزادی و بیباکی اور جرأت و جسارت کے جذبات کی پرورش اپنے دل و دماغ میں موصوف خود فرماتے رہتے ہیں اور اور جس کے بیج اپنی امت کے دل و دماغ میں اپنی تحریروں کے ذریعہ برابر بوتے رہتے ہیں۔ عادت و معمول کے مطابق وہی جسارت آمیز تعبیر شاید بیساختہ طور پر ہی دل و دماغ سے باہر نکلکر زبان قلم پر آہی گئی اور ہم سمجھتے ہیں کہ کلا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون کے مصداق موصوف کو اپنی ایسی تعبیرات میں کوئی قباحت بھی نظر نہ آئیگی اور وہ اسے اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ کی بیجا عقیدتمندی قرار دیتے ہوئے اسکا کوئی نوٹس لینا بھی خلاف شان سمجھیں گے۔

تقابلی مطالعہ

"مقطعات قرآنیہ" سے متعلق علامہ مودودی کی "تحقیق انیق" حاشیہ منقولہ میں پیش کیجا چکی ہے جسکے بے دلیل سات دعووں پر تبصرہ چل رہا ہے اسی تبصرہ میں آپ کے لطف کو دوبالا کرنے کیلئے اور اپنی بات کو مزید قابل توجہ بنانے کے خیال سے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی سلسلہ میں دوسرے مفسرین کرام کی

Scanned with CamScanner

تفسیری تصریحات بھی یکجا ذکر کردیں کہ تقابل باہم کی روشنی میں علامہ کی مندرجہ بالا "بےنظیر ولاجواب تحقیق" اپنے صحیح خدوخال میں آپ کے سامنے آجائے۔

اقوال مفسرین

نقل کرنے سے پہلے مختصر طور پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ تقریباً تمام ہی مفسرین کی تصریحات و تحریرات کا خلاصہ اس طور پر کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی مقطعات کے سلسلہ میں ابتداءً دو مسالک سامنے آتے ہیں ایک مسلک کے مطابق "مقطعات قرآنی" "متشابہات" کے تحت آتے ہیں جن کے یقینی معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں ان کے معنیٰ کی تفتیش اور کرید جائز ہی نہیں ہے۔ دوسرے مسلک کے مطابق یہ "متشابہات" میں تو داخل نہیں ہیں اسلئے ان کے معنی میں رائے زنی کیجا سکتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی ایک ہی مفہوم و مراد متعین ہو چنانچہ مختلف لوگوں سے انکی مختلف تاویلات و توجیہات منقول ہیں جو اتنی ہیں کہ ہم اس تبصرہ کو انکے نقل سے طول دینا پسند نہیں کرتے اس پس منظر میں اب حضرات مفسرین کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ تفسیر معالم التنزیل میں امام بغوی (متوفی ۵۱۶ھ) فرماتے ہیں

(الف) "امام شعبی اور ایک جماعت مفسرین کا قول ہے کہ " الٓمٓ " اور دوسرے مقطعات جو قرآنی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں یہ از قبیل متشابہات ہیں جنکا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ ایک "قرآنی راز" ہے (چیستاں نہیں) ہم ان الفاظ ہی پر ایمان لاتے ہیں اور اسکے مرادی معنی کو اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد کرتے ہیں (اگر کوئی عقلمند یہ سوال کرے کہ پھر ان کے ذکر سے کیا فائدہ تو اسکا جواب یہ ہے کہ)

Scanned with CamScanner

ان کے ذکر سے غرض یہ ہے کہ "مسلم حقیقی" سے ان پر یونہی ایمان لانے کا مطالبہ
کیا جائے گا وہ ان پر بے چون و چرا ایمان لے آئے گا" چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق
رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر کتاب میں کوئی خصوصی راز ہوتا ہے اسی طور پر
اللہ تعالیٰ کے اسرار قرآنی میں مقطعات ہیں جو سورتوں کی ابتداء میں پائے جاتے
ہیں۔ اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہر کتاب میں کوئی مخصوص بات
ہوتی ہے چنانچہ اس قرآن مجید کا خصوصی حصہ یہی مقطعات ہیں۔ داؤد بن
ابی ہند کہتے ہیں کہ میں حضرت امام شعبیؒ سے ان افتتاحی کلمات کے متعلق سوال
کرتا تو آپ فرماتے کہ اے داؤد ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے اور "قرآنی راز یہی فقرے
ہیں جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں لہٰذا انھیں چھوڑو ان کے سوا جو چاہتے
پوچھو"

(ب)" اور ایک جماعت نے کہا کہ ان کے معانی معلوم ہیں پھر اس جماعت کے
اختلافات بہت سے اقوال میں پھیل گئے (جنکی تفصیل سے سردست صرف نظر
کیا جاتا ہے)۔

۲۔ تفسیر کبیر میں علامہ فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:۔
" اللہ تعالیٰ کے قول " الٓمٓ " اور اس جیسے دوسرے کلمات کے بارے میں
(جو قرآنی سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں) لوگوں کے دو قول ہیں۔
(الف) یہ ایک پوشیدہ علم اور در پردہ راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے صرف
اپنے لئے مخصوص فرما رکھا ہے یہی قول ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کا اور ایسا ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی فرمایا ہے (تفصیلی روایت

نقل ہوئیکی)۔ (تفسیر کبیر ص۱۵۱) ۔

چند سطروں کے بعد اسی تفسیر کبیر میں ہے کہ امام شعبی سے ان کلمات کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے اسے نہ پوچھو اور ابوظبیان حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ علماء اسکی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔ اور حضرت حسین بن الفضل نے (تو صاف صاف) فرمادیا کہ یہ مقطعات متشابہات میں سے ہیں (تفسیر کبیر ص۱۵۱) ۔

متکلمین فلاسفہ اسکا انکار کرتے ہیں اور اپنے مدعا پر عقلی و نقلی دلائل پیش کرتے ہیں، اور آگے چل کر امام رازی نے ان لوگوں کے اقوال ذکر فرمائے ہیں جو مقطعات کو کو قابل فہم کہتے ہیں۔ یہ جملہ اقوال امام رازی کی نقل کے مطابق بیس ہیں جو تفسیر کبیر میں دیکھے جاسکتے ہیں (ص۱۵۲ و ص۱۵۳)

۳ ۔ تفسیر ابن کثیر میں حافظ عماد الدین ابوالفدا ابن کثیر دمشقی (متوفی ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں :۔

قرآنی سورتوں میں شروع میں جو مقطعات ہیں ان کے بارے میں مفسرین کو اختلاف ہے کچھ حضراتؒ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مقطعات اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں لہٰذا انھوں نے اللہ ہی کے سپرد کردیا اور خود ان لوگوں نے کوئی تفسیر ہی نہیں کی چنانچہ تفسیر قرطبی میں امام قرطبی نے (خلفائے اربعہ) حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی و علی مرتضیٰ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی قول نقل کیا ہے اور عامر شعبی سفیان ثوری، ربیع بن خثیم نے یہی کہا ہے اور ابو حاتم ابن حبان نے اسی قول کو کو اختیار کیا ہے (امام قرطبی کا یہ قول ابن کثیر نے نقل کیا ہے اسلیے یہ ایک قول

دو قول ہوگیا ہے)

دوسرا قول وہی ہے کہ ان کے معانی معلوم ہیں اور ہر ایک نے اپنے معانی بیان کئے ہیں (تفسیر ابن کثیر ص۶۵ ج۱)۔

۴۔ تفسیر ابی السعود میں علامہ ابو السعود نے اسی انداز میں دونوں قول نقل کئے ہیں حضرت علی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مذکورہ بالا قول نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت شعبی کے وہی مقولے ذکر کئے ہیں جو اوپر گذر گئے۔

اور ان کے معانی جاننے والوں کے وہی اختلافی اقوال بھی نقل کئے ہیں (تفسیر ابی السعود برحاشیہ تفسیر کبیر)

۵۔ تفسیر "غرائب القرآن" میں علامہ "قمی" نے امام رازی کی تفسیر کبیر ہی کے اقوال کی گویا تلخیص نقل فرمادی ہے (ملاحظہ ہو غرائب القرآن برحاشیہ طبری ص۱۱۱ ج۱)

۶۔ تفسیر طبری میں علامہ ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) نے بھی مجموعی طور پر تقریباً دس اقوال ذکر کئے ہیں جن میں سے ایک قول انکے "راز" ہونے کا بھی نقل کیا ہے لیکن کسی کی طرف اس قول کی نسبت نہیں کی ہے (تفسیر طبری ص۶۶ ج۱)

۷۔ تفسیر مظہری میں بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب مورث پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) فرماتے ہیں:۔

اس سے پہلے "مقطعات" سے متعلق مختلف اقوال ذکر فرما دیئے ہیں "میرے نزدیک حق بات یہی ہے کہ یہ مقطعات متشابہات میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے جسے عام لوگوں کو نہیں بتایا گیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

قاضی صاحب نے بھی اس موقع پر "سمرقندی" اور "قرطبی" کے حوالہ سے انھیں حضرات صحابہ کرام اور ائمہ عظام کے نام شمار کئے ہیں جو اوپر ابن کثیر کے حوالہ سے نقل کئے گئے ہیں۔ مزید برآں قاضی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام "سجاوندی" نے فرمایا کہ صدر اول کے حضرات سے یہی مروی ہے کہ یہ "مقطعات" اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے درمیان "راز" ہی ہیں۔ (تفسیر مظہری ص۱۴۱ ج ۱)

کمال ہوشمندی ملاحظہ ہو کہ

علامہ نے اپنے حاشیہ میں اس صراحت کی مطلق ضرورت محسوس نہ فرمائی کہ ذرا یہ بات تو صاف فرما دیتے کہ آخران مقطعات کے معانی کس دور تک معروف و متعارف رہے اور یہ اسلوب کب سے متروک ہونا شروع ہو گیا اور کب سے مفسرین کے لئے انکے معانی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔

علامہ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ

مقطعات کے معانی کو نزول قرآن مجید کے دور میں معلوم و معروف تسلیم کرکے بعد کے ادوار میں انکے یقینی معنی کو متروک قرار دینے کے نتیجہ میں خود اصل قرآن مجید اور اسکے جملہ معانی و مطالب سے متعلق بھی وہ تشکک و ارتیاب اور عدم اعتماد کی کیسی فضا تیار کئے دیتے ہیں؟ اب تو جس کا جی چاہے جس چیز کے متروک ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ کاش علامہ مفسر ہونے اور مفسر بننے کے فرق ہی کو سمجھ لیتے۔

علامہ کا یہ ارشاد کیا اسی روز کیلئے تھا کہ

" قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی" (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص۱۳)

اور مولانا علی میاں کا یہ تبصرہ بالکل برمحل تھا کہ

" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل مدت میں یہ کتاب غفلت و جہالت کی نذر رہی اسکے حقائق کو سمجھا نہیں جا سکا اور نزول قرآن کے تھوڑی ہی مدت کے بعد اس سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا" (منصب نبوت اور اسکے عالی مقام حاملین ص۷۶ تا ۸۱)

عربی کی مندرجہ بالا تفاسیر (جنکے حوالے اوپر نقل ہوئے) جو مختلف دور کی تصانیف ہیں ان کے مفسرین اس حقیقت سے کیسے بے خبر ہیں جسکا انکشاف علامہ نے اپنے حاشیہ میں فرمایا ہے ۔ ایک مفسر بھی تو علامہ کی ہمنوائی کے لئے تیار نہیں ہے نتیجہ وہی کہ۔ ؏ ۔ اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہو کر ۔

قابل غور ہے کہ

بقول علامہ جب "یہ مقطعات" نزول کے وقت معروف و متعارف تھے تو حضرات خلفائے راشدین حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم عبداللہ بن عباس

امام شعبی و سفیان ثوری حسین بن الفضل بلکہ ایک جماعت نے انکو "متشابہ" اور "راز" کیسے کہہ دیا (ملاحظہ ہو صفحاتِ گذشتہ میں حوالہ تفسیر بغوی ابن کثیر وغیرہ)۔

پھر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب تفسیر مظہری میں تو علامہ "سجاوندی" سے یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ صدر اول کے لوگوں سے ان مقطعات قرآنی کے "راز" ہونے ہی کی روایت منقول ہے۔

"قرآنی مقطعات"

اردو تراجم و تفاسیر کی روشنی میں

تفسیرات عربی کے حوالہ جات کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے جو تراجم و تفاسیر بآسانی ہمیں مل سکی ہیں انکے بھی کچھ اقتباسات پیش کر دیں کہ اردو داں طبقہ ان متداول کتب تفسیر و تراجم قرآن تک مراجعت کر کے ہمارے بیان پر مزید اطمینان کر سکے۔

۱۔ تفسیر فیض القرآن میں ہے "الف، لام میم حروف مقطعات میں سے ہیں یہ اللہ اور رسول کے درمیان ایک بھید ہے۔ اسکے اصل معانی تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ انکے معانی جس حد تک جبکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اس حد تک اسے اس کا علم ہے۔ اسکے علاوہ بزرگوں نے اپنی کیفیات کے مطابق بالکشف سمجھا ہے جسکا واقعی ہونا تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا (حاشیہ پر فرماتے ہیں) الم یہ سورہ کی سرخی اور اجمال ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیا گیا ہے" (فیض القرآن ص ۶ مطبوعہ کراچی)

Scanned with CamScanner

۲۔ تفسیر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:۔

"الٓمٓ بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حروفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ الٓمٓصٓ ان کو حروف مقطعہ کہا جاتا ہے ان میں ہر حرف جدا جدا ساکن پڑھا جاتا ہے الف، لام، میم۔

حروف مقطعہ جو اوائل سورہ میں آئے ہیں ان کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اسمائے الٰہیہ کے رموز ہیں، مگر جمہور صحابہ و تابعین اور علمائے امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز و اسرار ہیں جنکا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا علم بطور ایک "راز" کے دیا گیا ہو جسکی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تشریح و تفسیر میں کچھ منقول نہیں ہے۔ امام تفسیر قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"عامر شعبی، سفیان ثوری اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص اسرار و رموز ہوتے ہیں اسی طرح ان حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے اسی لئے یہ ان متشابہات میں سے ہیں جنکا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے۔ ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں مگر اس کے باوجود وہ ہمارے لئے فائدے سے خالی نہیں، اول تو انپر ایمان لانا پھر انکا پڑھنا ہمارے لئے ثواب عظیم ہے دوسرے انکے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہنچتے ہیں ــــــ علامہ قرطبی نے پھر فرمایا حضرت صدیق اکبر

فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمہور صحابہ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کے اسرار ہیں ہمیں ان پر ایمان لانا چاہیئے کہ اللہ کی طرف سے آئے ہیں اور جس طرح آئے ہیں انکی تلاوت کرنا چاہیئے مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں۔

ابن کثیر نے بھی قرطبی وغیرہ سے نقل کر کے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تشبیہ اور تسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، اسلئے اسکو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے" (معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب ص۱۰۷ جلد ۱)

۳۔ حافظ فتح محمد خان صاحب کے مترجم قرآن مجید کے حاشیہ پر ہے :۔

"الٓمٓ اور اسی طرح کے اور حروف جو قرآن مجید کی متعدد سورتوں کے شروع میں آئے ہیں اور جنکو حروف مقطعہ کہتے ہیں" اسرار الٰہی " میں سے ہیں انپر بے قیل و قال ایمان لانا چاہیئے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کچھ معنی بیان نہیں فرمائے ہیں صرف یہی فرمایا ہے کہ الف ایک حرف اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے" (حاشیہ ترجمہ جالندھری)۔

۴۔ حضرت شیخ الھند علیہ الرحمہ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں:۔

" الٓمٓ ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں، ان کے اصلی معنی تک اوروں کی رسائی نہیں بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور اسکے رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا اور بعض اکابر سے جو ان کے معنی منقول ہیں اس سے صرف

تمثیل وتشبیہ وتسہیل مقصود ہے یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے تو اب اس کو رائے شخصی کہکر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے جو تحقیق علماء کے خلاف ہے"

(حاشیہ حضرت شیخ الہند)

۵۔ مفسر حقانی نے بھی اپنی تفسیر حقانی میں بڑی مفصل بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"علماء کا ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ منجملہ متشابہات کے ہیں جنکو خدا تعالیٰ اور اسکا رسول ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا (اسکے بعد وہی حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اقوال نقل کئے ہیں پھر دوسرا قول انکفیں اختلافات کے ساتھ بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے خود اپنا فیصلہ نہیں تحریر فرمایا اسلئے تفسیر کے حاشیہ پر مولانا انظر شاہ صاحب کو فیصلہ فرمانا پڑا موصوف حاشیہ میں فرماتے ہیں:

"افسوس کہ گفتگو مفسر کی مقطعات پر طویل ہونے کے ساتھ بے مزہ بھی ہے مختصر اور راجح قول یہ ہے کہ یہ حروف متشابہات قرآنی میں سے ہیں کسی مصلحت کیوجہ سے علم انکا عام بندوں کو نہیں دیا گیا۔"

(تفسیر حقانی ص۱۴ تا ص۱۶ جلد اول)

۶۔ حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں

"ان حروف کے معانی سے عوام کو اطلاع نہیں دی گئی یشا بد حامل وحی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کے ساتھ وہی باتیں تبلائی ہیں جنکے نہ جاننے سے دین میں کوئی حرج اور نقصان لازم آتا تھا لیکن ان حروف کا مفہوم نہ جاننے سے کوئی حرج نہیں ہے اسلئے ہمکو بھی ایسے امور کی تفتیش نہ چاہیئے۔" (تلخیص

بیان القرآن میں حاشیہ حمائل شریف)

۷۔ ایک دوسرے حمائل شریف کے حاشیہ پر تفسیر فتح البیان سے منقول :۔

"یہ حروف مقطعات ہیں اور اسرار وحی میں سے ہیں کسی مصلحت سے خدا نے انکے معانی بندوں پر ظاہر نہیں کئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے انکی تفسیر سے خاموشی اختیار فرمائی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ تین حروف ہیں ہر حرف پر دس نیکی ہے۔ وہ جو مفسرین نے انکے معانی بیان کئے ہیں وہ صرف قیاس ہے"

(حمائل شریف طبع کردہ نور محمد تاجر کتب دہلی)

۸۔ علامہ عبد الماجد دریاآبادی تفسیر ماجدی میں فرماتے ہیں :۔

"مشاہیر صحابہ وتابعین میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف متشابہات قرآنی میں سے ہیں جنکا علم کسی مصلحت سے عام بندوں کو نہیں دیا گیا ہے ۔ یہ اعتراض کہ قرآن مجید کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف کو بھی ہمارے لئے قابل فہم ہونا لازمی ہے کچھ زیادہ باوقعت وباوزن نہیں قرآن کے اندر اور جتنے مضامین ومطالب ہیں کیا وہ سب ہر کس وناکس کی سمجھ میں آگئے ہیں ؟

(تفسیر ماجدی ص۵ جلد۱)

۹۔ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی

علامہ کی روشنی طبع پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ مصرع پہلے بھی

عرض کیا جا چکا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ علامہ کی عجیب و غریب نادر تحقیقات دیکھ دیکھکر یہ مصرع تو اکثر یاد آتا رہتا ہے لیکن بار بار کی تکرار بار بھی ہوسکتی ہے اسلئے مصرعۂ مذکور دل ہی دل میں پڑھکر" خراج تحسین" پیش کر دیتا ہوں۔

عربی و اردو دونوں ہی زبانوں کی سب تفسیر و تراجم کے متعدد و مستند حوالے ابتک پیش کئے گئے انھیں دیکھکر حضرات ناظرین بھی پوری طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآنی مقطعات کے سلسلہ میں ابتداءً تو دو ہی گروہ سامنے آتے ہیں، ایک گروہ انھیں متشابہ اور رمز خداوندی بتاتا ہے جمہور صحابہ و مفسرین اسی کے قائل ہیں دوسرا گروہ انکے کچھ معانی بھی متعین کرتا ہے اس گروہ سے متعلق اشخاص الگ الگ باتیں کہتے ہیں جو تاویل و توجیہ کی حد تک قابل قبول سمجھی گئی ہیں کسی گروہ نے اپنی توجیہ کو مرادِ خداوندی نہیں بتایا ہے کیونکہ "حقیقی مرادی معنی" کسی کے نزدیک ثابت و منقول ہی نہیں ہیں۔

اور ہمارے علامہ نے (جنھیں تقلید سلف سے سخت نفرت و بیزاری ہے) یہ پسند نہ فرمایا کہ وہ بھی انھیں لوگوں میں شامل ہوکر کوئی قول اختیار فرمالیں اس لئے آں موصوف نے ایک تیسری بات فرمادی وہ یہ کہ ان کلمات کے "حقیقی مرادی معنی" تھے اور یقیناً تھے کیونکہ نزول قرآن مجید کے دور میں یہ اسلوب عام طور پر متعارف تھا لیکن افسوس کہ اب انکے معنی نہیں بتائے جاسکتے کیونکہ مرور زمانہ سے وہ اسلوب متروک ہوتا گیا اب اسکا عارف عالم کوئی باقی ہی نہیں رہا جو انکے حقیقی معنی متعین کرسکے

ع: جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

علامہ کا یہ ارشاد پڑھکر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد زبان پر آجاتا ہے کَبُرَتْ

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۔ ؎ بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور اس میں کوئی شک نہیں) جو یہ کہتے ہیں محض جھوٹ ہے) (سورۂ کہف ترجمۂ جالندہری)

علامہ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ قرآن شریف کے کسی "لفظ بلکہ کسی "نقطہ" کے متعلق یا اسکی "تشریح" کے متعلق یہ فرما دینا کہ یہ بات نزول قرآن کے وقت تو مفہوم و محفوظ تھی بعد میں اہل علم اور اہل قرآن اسکو محفوظ نہ رکھ سکے اللہ تعالیٰ کے وعدۂ حفظ قرآن پر ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے

دوسری طرف علامہ کی یہ عبارت بھی قابل توجہ ہے کہ موصوف اسی ایک حاشیہ میں دو متضاد سی باتیں ارشاد فرما جاتے ہیں یعنی ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ "مقطعات قرآنی" کی تشریح کتب تفسیر و حدیث کے مصنفین محفوظ نہ رکھ سکے اور دوسری طرف اسی جگہ یہ بھی ارشاد فرما رہے ہیں کہ مقطعات کے نمونہ پر "کلام جاہلیت" کی مثالیں اپنی تشریح کے ساتھ موجود ہیں "یا للعجب" ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علامہ نے یہ حاشیہ تحریر فرما کر لوگوں کو قرآن مجید سے قریب کرنے کی کوئی کوشش فرمائی ہے یا اس طرح انکے دلوں میں قرآن مجید اور اسکی "تفسیر و تشریح" کی طرف سے شک وارتیاب کی تخم ریزی فرمائی ہے۔

تعجب ہوتا ہے علامہ کے اس انداز تحقیق پر

ابن جریر طبری (جسکی شیعت بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے) کی ذرا سی شہ موصوف کو کیا مل گئی کہ اسکے سہارے متقدمین کی ساری تصریحات سے مردو آنکھیں

پسند کر کے صرف طبری شیعی کی ضعیف و مجروح اور متروک پرائی رائے لیکر اسے اپنی طبعزاد ذہنی تحقیق کی شکل میں پیش کر دینے کی جسارت کر بیٹھے ۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جماعت مفسرین میں سے کسی ایک مستند مفسر نے بھی اس "ٹوٹی بیا کھی" کا سہارا نہیں لیا ہے ۔ بلکہ علامہ ابن کثیر دمشقی اور قاضی ثناء اللہ صاحب نیز بعض دوسرے حضرات نے اسکی اچھی طرح تردید فرماتے ہوئے ان اشعار کو بحث سے غیر متعلق قرار دیدیا ہے جو اس سلسلہ میں نقل کئے گئے ہیں ۔

نرالا طرز استدلال

صفحات گذشتہ میں علامہ کے حاشیہ تفہیم کا اقتباس پیش کر دینے کے بعد اسکا تجزیہ بھی پیش ہو چکا جسمیں دکھلایا گیا ہے کہ علامہ نے ایک دو نہیں سات سات دعوے فرمائے ہیں اور سارے سب بے دلیل ہیں ۔

منجملہ ان دعووں کے ایک دعویٰ (جو پچھلے دعووں کیلئے دلیل کا درجہ بھی رکھتا ہے) یہ بھی ہے کہ "مقطعات قرآنی" اگر غیر مفہوم الفاظ ہیں تو صحابہ کرام کی جانب سے انکی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے "سوال و استفسار" منقول ہونا چاہیئے تھا اور اسکے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب مروی ہونا چاہیئے تھا کہ یہ الفاظ از قبیل متشابہات اور ناقابل فہم ہیں (جواب کی بات علامہ نے نہیں فرمائی ہے علامہ نے تو صرف سوال و استفسار ثابت نہ ہونے کو ہی اپنے مدعا کی دلیل بنایا ہے) ۔ اور چونکہ روایات میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا کوئی سوال و استفسار منقول نہیں ہے لہذا ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہے کہ یہ الفاظ

اس دور میں پوری طرح مفہوم تھے ہر کوئی اس اسلوب سے واقف تھا۔

یہ ہے علامہ کی تقریر استدلال جو راقم السطور سمجھ سکا ہے۔ علامہ کی طرح خدانخواستہ احقر کو اپنے فہم پر ہرگز ہرگز حد سے زیادہ اعتماد نہیں ہے اسلئے یہ بھی ممکن ہے کہ راقم السطور کو علامہ کا یہ انوکھا استدلال سمجھنے میں کچھ غلط فہمی ہو رہی ہو لہذا ناظرین سے یہ التماس بھی ہے کہ اگر علامہ کا استدلال سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہو تو حضرات اہل علم احقر کو ضرور مطلع فرما کر اعتراف قصور فہم کا موقع دیں لیکن اگر راقم السطور نے علامہ کے استدلال کی صحیح تقریر پیش کی ہے تو ازراہِ کرم حضرات اہل علم انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ دیں کہ علامہ کا یہ طرز استدلال کہاں تک معقول ہے؟ کیا کسی بات کا منقول ومروی نہ ہونا واقعتاً یہ بات ثابت کر بھی سکتا ہے کہ وہ بات فی الحقیقت نہیں ہوئی۔ علامہ کی ارشاد فرمودہ بات انکے دعوی و مدعا کیلئے فی الجملہ "قرینہ" تو کہی جا سکتی ہے لیکن کوئی قرینہ کا آدمی اسے دلیل کے طور پر تسلیم نہ کر سکے گا۔

آخر علامہ نے یہ خیال کیوں نہ فرمایا کہ

خلفائے راشدین و حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر اور سابقین اولین صحابہ جو ان "مقطعات" کو "سر اللہ" اور "سر القرآن" اور ناقابل فہم فرما رہے ہیں (جیسا کہ صفحات گذشتہ میں تفسیر قرطبی کے حوالہ سے علامہ ابن کثیر و قاضی ثناء اللہ صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ کی تحریرات میں تفصیل کے ساتھ نقل کیا جا چکا ہے) تو یہ حضرات ایسی بات جو کسی طرح مدرک بالعقل

نہیں ہے اپنی طرف سے گڑھ کر کیسے فرما دیں گے ہو نہ ہو یہ بات انھوں نے لسانِ نبوت ہی سے سنی ہو گی اور اگر اسی استدلال کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہوئے مزید عقل سے کام لیا جائے تو یہ بھی سمجھا اور کہا جا سکتا ہے کہ پہلے ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سوال یا استفسار فرمایا ہو گا۔ اسکا جواب معلوم ہو جانے پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایسے سوالات سے خاموشی اختیار کر لی اور دوسروں کو یہ بتا گئے کہ قرآنی مقطعات خدا و رسول ؐ کے درمیان راز ہیں۔

حضرات اہل علم و فہم فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ

علامہ کے مذکورہ بالا "نفی پر مبنی" استدلال سے "یہ مبنی بر ثبوت" استدلال یقیناً مطابق اصول اور بالکل معقول ہے فللہ الحمد ولہ الشکر۔

اچھا لیجئے یہ روایت بھی حاضر ہے

علامہ کے منجملہ سات دعووں کے پانچواں دعویٰ یا استدلال یہ تھا کہ "یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے معنی پوچھے ہوں"۔

موصوف کے اس استدلال کی حقیقت اوپر پیش کر دی گئی جس سے علامہ کی "معقولیت پسندی" اور "صلاحیتِ استدلال" کا بھرم بھی اچھی طرح کھل گیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اس موقع پر اس روایت کا بھی ذکر کرتے چلیں جو "مقطعات" کے سلسلہ میں متعدد کتب تفسیر میں منقول ہے۔ اس روایت کی روشنی

ہیں صاف پڑھا جا سکتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام کے دور میں یہ مقطعات کا اسلوب ہرگز معروف و متعارف نہ تھا

جس روایت کو ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں یہ متعدد کتب تفسیر میں منقول ہے۔ اور ہم جس روایت کے الفاظ کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں وہ تفسیر ابن جریر طبری میں بھی ہے جو علامہ کے نزدیک تو معتبر ہے ہی۔ ملاحظہ ہو روایت یہ ہے (ملاحظہ ہو طبری جلد اص ۲)

روایت ابن جریر طبری

" اپنی سند کے ساتھ جابر بن عبداللہ بن وثاب سے راوی ہیں کہ ——— ابو یاسر بن اخطب (یہودی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گذرا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ بقرہ الٓمٓ ذلک الکتاب لاریب فیہ تلاوت فرما رہے تھے تو وہ وہاں سے چل کر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آیا جہاں بہت سے یہودی موجود تھے، اور بولا تم جانتے بھی ہو میں نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ابھی تلاوت کرتے سنا ہے جو کلام ان پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے یعنی الٓمٓ ذالک الکتاب لاریب فیہ تو وہ سب بولے کہ تو نے خود سنا ہے؟ بولا ہاں میں نے سنا ہے چنانچہ حیی بن اخطب وہاں سے اٹھکر چلا اور وہ سب یہودی بھی ساتھ ساتھ تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

Scanned with CamScanner

حاضر ہو کر ان سب نے سوال کیا کہ ایسا ذکر کیا جا رہا ہے (یہ کہاں تک صحیح ہے کہ) آپ اپنے نازل شدہ قرآن میں یہ الفاظ تلاوت کرتے ہیں الٓمّٓ ذالک الکتاب لاریب فیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، تو بولے کیا یہ کلمات حضرت جبرئیل آپ تک پہونچا گئے ہیں اللہ تعالیٰ کیطرف سے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ کہنے لگے آپ سے پہلے اللہ تعالےٰ نے بہت سے انبیائے کرام مبعوث فرمائے لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں اس نے کسی نبی کے بارے میں دنیا میں قیام کی مدت بیان نہیں فرمائی ہاں ایک آپ ہی ہیں کہ آپکو آپ کے قیام کی مدت بھی بتا دی گئی ہے اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر (الٓمّٓ کی تشریح میں) کہنے لگا کہ "الف" کے ایک، لام کے تیس ۳۰ اور میم کے چالیس ۴۰ کل اکہتر سال ہوتے ہیں۔ تو کیا آپ لوگ کسی ایسے نبی کا دین قبول کریں گے جسکی کل مدت ہی صرف اکہتر ۷۱ سال ہو۔ پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر گویا ہوا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے پاس اسکے علاوہ کچھ اور بھی ہے آپ نے فرمایا ہاں ہاں بولا وہ کیا ہے؟ فرمایا "الٓمّٓصٓ" وہ بولا کہ یہ تو اس سے زیادہ بھاری اور طویل مدت ہے یعنی الف کے ایک ۱ لام کے تیس ۳۰ میم کے چالیس ۴۰ اور صاد کے نوے ۹۰ اسکا مجموعہ تو ایک سو اکسٹھ ہو گیا کیا اسکے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، بولا کیا؟ آپ نے

فرمایا " الٓر " بولا یہ بھی بھاری اور طویل مدت ہے یعنی الف ایک (۱)
لام تیس (۳۰) اور را کے دو سو (۲۰۰) یہ تو دو سو اکتیس سال ہو گئے۔ پھر بولا کیسا کچھ
اور بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہاں " المٓر " کہا یہ تو اور بھی بھاری اور
لمبی مدت ہو گئی کہ الف کے ایک (۱) لام کے تیس (۳۰) اور میم کے چالیس (۴۰) اور
را کے دو سو (۲۰۰) یہ تو دو سو اکہتر سال ہو گئے

پھر بولا کہ آپ کا معاملہ تو کچھ سمجھ میں نہ آسکا ہم تو کچھ نہ سمجھ سکے کہ آپکو
کتنی مدت دی گئی ہے تھوڑی یا زیادہ پھر وہ سب وہاں سے اٹھکر
چلدیئے تو پھر ابو یاسر نے اپنے بھائی حیی بن اخطب اور ساتھ جتنے
بھی علمائے یہود تھے سب سے کہا کہ تمھیں کیا خبر ہو سکتا ہے کہ (حضرت) محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم) کیلئے یہ ساری ہی مدت مجموعی طور پر مقرر ہوئی ہو یعنی
۷۱ + ۲۳۱ + ۲۷۱ + ۱۶۱ جنکا مجموعہ سات سو چونتیس سال ہو جاتے
ہیں لہٰذا انکا معاملہ تو واقعی سمجھ میں نہ آسکا۔

روایت طبری کی تائیدات

سطور بالا میں علامہ کے اطمینان کیلئے انکے نزدیک مسلم و معتبر تفسیر ابن جریر
طبری کی ایک مفصل روایت پیش کردی گئی جسکی موجودگی میں کسی صاحب علم و فہم کا یہ فرمادینا
(کہ "اسلوب مقطعات" نزول قرآن کے دور میں عام طور پر معروف و متعارف تھا خطیب شعراء
دونوں اسی اسلوب سے کام لیتے تھے سامعین بالعموم جانتے تھے کہ اس سے کیا مراد ہے یہی وجہ
ہے کہ صحابہ کرام سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

Scanned with CamScanner

ان کے معنی پوچھے ہوں) بالکل آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف اور بڑی ہی بڑی علمی جسارت ہے جسکی ہمت کوئی بڑا علامہ ہی کرسکتا ہے معمولی آدمی "نکتہ گیری" کے اندیشہ میں یہ جرأت کہاں کرسکے گا۔

تائید ۱ طبری کی مندرجہ بالا روایت علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر ابن کثیر ص ۶۹ جلد ۱ پر نقل فرمائی ہے اور اسکے ضعف کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے اقوال کی تردید کے لئے قابل استدلال بھی سمجھا ہے۔

تائید ۲ طبری کی مندرجہ بالا روایت بغیر کسی کلام کے نقل محض کے طور پر علامہ رازی نے بھی ص ۱۵۲ ج ۱ میں ذکر کی ہے۔

تائید ۳ طبری کی مذکورہ بالا روایت خود حاشیہ طبری پر تفسیر غرائب القرآن میں نقل کی گئی ہے (حاشیہ ص ۱۲۱ ج ۱)۔

تائید ۴ طبری کی مذکورہ بالا روایت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نے اپنی تفسیر مظہری میں ص ۱۳ ج ۱ پر نقل کی ہے بلکہ موصوف نے تفسیر طبری کے علاوہ امام بخاری کی تاریخ کا بھی حوالہ دیا ہے۔

ایسی صورت میں جبکہ زمانہ نزول قرآن میں ان "مقطعات" کا حقیقی مفہوم سمجھا نہ جا سکا تھا اور یہ نہ سمجھنے والے کون تھے؟ یہ علمائے یہود تھے (جنکے تعلیم یافتہ ہونے کا اقرار خود علامہ کو بھی ہے) تو یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانہ کے "صاحبان علم" تو مقطعات سے بے خبر اور اٹکل پچو ادھر اُدھر کی ہانک رہے ہوں لیکن زمانہ نزول قرآن کے چودہ سو سال بعد علم وتحقیق سے سرشار ہوکر کوئی محقق یہ ہانک لگائے کہ "مقطعات کا اسلوب نزول قرآن کے دور میں تو معروف ومتعارف تھا بعد میں متروک ہوتا چلا گیا"

تو آپ ایسے محقق کیلئے کیا ارشاد فرمائیں گے؟ ؏ مسلماں تو نہیں انصاف سے کہیو خدا لگتی ۔

کوئی علامہ سے ذرا دریافت کرے کہ

مفسر علام ہم نے آپکی یہ نرالی اور خالص منطقی بات چلئے تسلیم کرلی کہ مقطعات چیستان نہ تھے نزول قرآن کے وقت ہر صحابی کو مفہوم و مطلب معلوم تھا تو کیا ان حضرات صحابہ کی اولادیں بھی آجکل کے ہم لوگوں کی اولاد کی طرح شعور آتے ہی انگلش اسکولوں میں بھیج دی جاتی تھیں اور انھوں نے اپنے بزرگوں سے قرآنی تعلیم مطلق حاصل نہ کی تھی؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں دینے کی جسارت نہ کی جاسکے گی اور یہی جواب ہوگا کہ بیشک حضرات صحابۂ کرام نے اپنی اولاد کو "قرآنی تعلیم" دی اور یقیناً دی ۔

پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ انکی اولاد نے "مقطعات" کا مفہوم ان سے سیکھا یا نہیں سیکھا اس سوال کا جواب بھی آپ نفی میں نہ دیں تو اچھا ہے ۔ نفی کے جواب سے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے مگر یہ صورت آپ ہی کی ارشاد فرمائی اس منطق کے خلاف ہے جو آپ نے اس جگہ استعمال فرمائی ہے کہ ان کے پوچھنے کی کوئی روایت منقول نہیں ہے ۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بچے بھی پیدائشی طور پر قرآن مجید تو چاہے پڑھے ہوئے نہ ہوں لیکن مقطعات کے مطلب سے وہ ضرور آشنا تھے ورنہ ان کے پوچھنے کی روایت منقول تو ہوتی ؟

الغرض جناب کی نرالی منطق پر جرح کا یہ صرف ایک نمونہ ہے ۔ یہ سلسلۂ سوالات ہر دور میں قائم کیا جاسکتا ہے اور آپکو سوال و جواب کے دائرے میں رکھکر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ آپ اس نامبارک و نامسعود دور کی ذرا نشاندہی فرمادیں جس دور سے مقطعات کا علم

لوگوں سے اٹھا لیا گیا ہو۔

یہ تبصرہ آخری منزلوں میں

علامہ کے حاشیۂ تفہیم ؏ پر یہ تبصرہ چل رہا ہے جو طویل سے طویل تر ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن حالات کے صحیح و معقول تقاضے سے مجبور ہو کر ہی یہ تفصیل و تطویل گوارا کیجا رہی ہے۔ بقول کسے "من آنم کہ من دانم" راقم السطور کو اپنی کہتری و گمنامی کا پورا پورا اعتراف ہے جبکہ علامہ مودودی ایک معروف و بلند قامت شخصیت کے حامل ہیں احقر کو اس بات کا بجا طور پر احساس ہے کہ علامہ کی تفہیم پر کوئی تبصرہ اگر صرف "اقوال" پر مشتمل ہوگا تو ناظرین کی ایک بڑی تعداد اسے قابل اعتنا اور درخور توجہ بھی نہ گردانے گی اس لئے اسبات کا پابندی کے ساتھ اہتمام ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اسکی تائیدات و حوالہ جات بھی ضرور ذکر کئے جائیں محض خوف تطویل کے باعث اسے نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب و معقول نہ ہوگا۔

؏ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

مقطعات قرآن کے سلسلے میں علامہ نے جو مضحکہ خیز انداز اختیار فرمایا ہے ہمیں پورا یقین ہے کہ موصوف کی "ذہنی غلامی" فرمانے والوں کے سوا ہر صاحب علم و فہم اسے پڑھکر اسکی "مضحکہ خیزی" سے اختلاف نہ کر سکے گا۔

بہر حال علامہ نے اپنے حاشیۂ تفہیم کی ابتدائی سطور میں جو بے مقصد خامہ فرسائی فرمائی ہے شاید اسکی "بے مقصدیت" خود ان پر بھی اچھی طرح روشن تھی اسلئے آخر میں

اس سوال کو نظر انداز بھی نہ فرما سکے جو "مقطعات" کے سلسلہ میں عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ جب مقطعات قرآنی ناقابل فہم ہیں تو ان کا نزول کیوں ہوا؟ یا علامہ کی تشریح کے مطابق سوال یوں ہوگا کہ جب مقطعات قرآنی کے معانی و مطالب ہمارے سلف کی غفلت سے فراموش ہو گئے تو اب ان مقطعات ہی کو قرآن مجید میں کیوں باقی رکھا گیا انھیں بھی بھلا دیا ہوتا "نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری" قرآن مجید میں نہ یہ حروف "مقطعات" ہوتے نہ ان "بیچاروں" کے حل میں سر کھپانا پڑتا - چنانچہ موصوف نے اپنے حاشیہ کے آخری حصہ میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے ناظرین کو دل بہلانے کیلئے ایک "دل بہلاوا" اور "کھلونا" مرحمت فرمایا ہے موصوف کا یہ ارشاد دل بہلاوا اور کھلونا ہی کہا جا سکتا ہے :-

> "ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنیکا انحصار ہے اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معانی نہ جانتے تو اسکے "راہ راست" پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا لہٰذا ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو"

مدرسہ خانقاہ پر فقرہ بازوں کو شاید "یہ فقرہ بازی" گوارا نہ ہو

راقم السطور کو تو بہرحال اس موقع پر علامہ کا یہ "کھلونا" (ذرا دیر کے لئے اسکا پرزہ پرزہ کھول کر ہی) ناظرین کو دکھلانا ہے - علامہ کی یہ دلیل ذرا ادھوری شکل میں آپ کے سامنے آئی ہے اسکی مکمل شکل یوں بنتی ہے :-

(۱) قرآن مجید کے نہ ہی اجزاء اور الفاظ قابل اعتناء ہیں جن پر ہدایت کا انحصار ہو

(۲) ظاہر ہے کہ ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار نہیں ہے اسلئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید کے یہ حروف مقطعات قابلِ اعتنا نہیں ہیں ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو۔

اس موقع پر یہ وضاحت بھی لطف سے خالی نہ ہوگی کہ ہم نے سطور بالا میں مدرسہ کے نام سے پڑھنے والوں کی رعایت کرتے ہوئے مدرسہ میں پڑھائی جانے والی منطق کی اصطلاحات کا مطلق نام نہیں لیا ہے کہ وہ حضرات بھی بغیر کسی سرگرانی کے علامہ کی دلیل کو اسکی اصل شکل میں دیکھ لیں۔

علامہ کی دلیل پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد ناظرین تفہیم کو پورا پورا حق ہے کہ موصوف کی اس دلیل سے جتنا فائدہ اٹھا سکیں اٹھا لیں اور قرآن مجید کے ہر لفظ کا تجزیہ کر کے پہلے یہ دیکھ لیں کہ کس لفظ پر ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور کس پر نہیں جس جس لفظ پر ہدایت کا انحصار سمجھ میں نہ آئے اسکو یوں ہی سرسری اور نظری قرار دیدیں

جلد ساز کا مشہور لطیفہ

کسی جلد ساز کے متعلق یہ لطیفہ مشہور ہے کہ اسکے پاس جو کتاب جلد سازی کیلئے آتی وہ اس میں کچھ نہ کچھ حک و اصلاح اور ردو بدل ضرور کر دیتا ایک بار کسی صاحب نے ایک نہایت نادر قلمی قرآن مجید جلد سازی کیلئے دیا اور بڑی سختی سے تاکید کر دی کہ دیکھو بھائی یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس میں تمہاری اصلاح کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہرگز ہرگز کہیں رد و بدل نہ کر دینا۔ جلد ساز صاحب نے انکے سامنے پکا وعدہ کر لیا اور پوری طرح یقین دہانی کر دی کہ اس قرآن مجید وہ ہرگز ہرگز

کہیں حک و اصلاح نہ فرمائیں گے۔ صاحب قرآن مجید جب اپنا قرآن مجید لینے آئے تو انکے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی کیونکہ جلد ساز صاحب نے اپنی عادت کے مطابق جگہ جگہ اس "کلام اللہ" کو بھی اپنی اصلاح سے آراستہ فرما دیا تھا باز پرس کرنے پر وہ فرماتے ہیں، جناب والا میں بھلا کلام پاک میں اصلاح کرتا یہ ہرگز میری مجال نہ تھی لیکن میں نے متعدد مقامات پر کچھ ایسے الفاظ دیکھے جنکا تعلق نہ تو قرآن مجید ہی سے کچھ سمجھ میں آسکا (ممکن ہے یہ بھی کہا ہو کہ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کا کوئی انحصار بھی ان پہ نظر نہ آیا) مثلاً کہیں بڑے بڑے کافروں کے نام لکھے ہوئے تھے، کہیں مچھر اور مکھی کے عربی نام لکھے ہوئے تھے، کہیں کلب و خنزیر جیسے نجس جانوروں کے نام تھے اور بہت سی جگہ پر تو کم بخت شیطان مردود کا نام لکھا ہوا تھا ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں کا قرآن پاک میں کہاں ذکر آیا ہوگا (پھر ان پر ہدایت بھی کچھ موقوف نہیں ہے) اس لئے میں نے ہر ایسی چیز کا ذکر قرآن مجید میں رکھنا مناسب نہ سمجھا اور سب ناموں کو اس میں سے مٹا دیا اور انکی جگہ پُر کرنے کیلئے کہیں جناب کا نام نامی اور کہیں جناب کے والد بزرگوار کا نام نامی لکھ دیا۔

یہ لطیفہ نظر انداز نہ کیا جاسکے گا

لطیفہ مذکور خدا جانے مبالغہ آمیز حقیقت ہے یا بلا مبالغہ صرف افسانہ ہی ہے، اسکے باوجود کوئی صاحب اسے صرف لطیفہ کہکر اپنے قہقہوں کے درمیان اسے گم کر کے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس وقت تو یہ لطیفہ بہت ہی برمحل اور معنی خیز ثابت ہو رہا ہے۔

علامہ کا یہ کھلونا اور دل بہلاوا (جس پر تبصرہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں) دو پرزوں پر مشتمل تھا پرزہ نمبر ۱ کی حقیقت ناظرین نے ملاحظہ فرمائی کہ کس طرح پرزہ پرزہ ہو گیا ہے۔ اس کھلونے کا دوسرا پرزہ بھی اسی کارخانہ کا ڈھلا ہوا ہے اس پر مزید تبصرہ کر کے اپنا اور ناظرین کا وقت عزیز کیا ضائع کیا جائے اسلئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہ علامہ کے کھلونے پر مزید تبصرہ کی زحمت کیوں اٹھائی جائے یہ پرزہ تو پہلے پرزہ کا حشر دیکھکر ہی پرزہ پرزہ ہوا جا رہا ہے

علامہ کو یہ بات تو شاید معلوم ہی ہو گی کہ

قرآن مجید کے بہت سارے نام ہیں جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں کہیں پر علامہ سیوطی کی "الاتقان" سے نقل بھی کر آئے ہیں ان ناموں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن مجید ان تمام ہی ناموں کا مظہر اور انکا مصداق ہے۔ یعنی جس طرح قرآن مجید ہدایت ونور، ذکر و موعظت ہے اسی طرح یہ قرآن مجید مثانی و متشابہ بھی ہے، منادی ایمان و شفائے روح و جسم بھی ہے۔ کسے خبر کہ ان حروف مقطعات سے ہمیں کیا کیا فائدے پہونچ سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے یہ مقطعات ہمیں انھیں بغیر سمجھے ہوئے ندائے ایمان دیتے ہوں اور ہم میں سے کچھ لوگ اس ندائے ایمان اور امتحان ایمان سے غافل ہو کر انھیں "بے مصرف ہدایت" قرار دیکر ندائے ایمانی سے روگردانی بھی کر رہے ہوں۔

مقطعات قرآنی کی حکمتیں اور فائدے بھی ملاحظہ ہوں

مولانا روم علیہ الرحمہ کا یہ شعر پہلے بھی کسی موقع پر پیش کیا جا چکا ہے

قند مکرر کے طور پر ملاحظہ ہو سہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود ۔ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مدرسہ و خانقاہ کا مذاق اُڑانے والے مذاق تو اڑاتے ہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ قرآن مجید کے اسرار و رموز نہ آرام کرسی پر مطالعہ کرنے سے حل ہوتے ہیں نہ سینٹرل جیل ملتان میں حل ہوتے ہیں قرآنی رموز و اسرار کو تو اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ ہی سمجھتے ہیں جنکا باطنی تعلق صاحب کلام سے براہِ راست ہوتا ہے قرآن مجید ایسی کتاب نہیں ہے جسکے اسرار و رموز اولیاء اللہ و اہل دین کا مذاق اُڑانے والوں پر منکشف ہو جائیں ۔

مقطعات قرآنی کی حکمتیں اور فائدے "معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب کی نقل کے مطابق امام تفسیر علامہ قرطبی کی تفسیر سے نقل ہیں فرماتے ہیں : ۔

" یہ حروف (مقطعات) رموز و اسرار ہیں جسکا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسکا علم بطور ایک "راز" کے دیا گیا ہو جسکی تبلیغ امت کے لئے روک دی گئی ہو ۔ ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں مگر اسکے باوجود فائدے سے خالی نہیں ۔ (اول) تو ان پر ایمان لانا ، پھر انکا پڑھنا (جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ الم میں الف ، لام ، میم تین حرف ہے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں) ہمارے لئے ثواب عظیم ہے دوسرے انکے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہونچتے ہیں " (معارف القرآن ص ۱۰۷ جلد اول)

بعد از خرابی بسیار

علامہ کو آخر میں وہی اعتراف شکست کرنا پڑا لیکن بہت کچھ مظاہرۂ فنکاری کے بعد اگر یہی بات وہ پہلے ہی تحریر فرما دیتے تو بھلا انکی اس تحقیق و تدقیق اور کاوش و تلاش پر کیسے روشنی پڑتی جسکا اظہار موصوف اپنے دیباچہ و مقدمہ میں کر آئے تھے ۔ حروف مقطعات کے سلسلہ میں علامہ کی اس تحقیق انیق سے (جو صفحات گذشتہ میں ملاحظہ سے گذر چکی ہے) صاف ظاہر ہو گیا کہ موصوف نے مقطعات کے بارے میں اپنی تحقیق کی ابتدا تو بڑی بلند آہنگی کے ساتھ تمام مفسرین کی تحریرات و تصریحات سے بالکل بے نیاز ہو کر فرمائی تھی لیکن تدریجی طور پر آہستہ آہستہ "رجعت قہقرہ" فرماتے ہوئے آخر میں موصوف اسی "مقام عجز و قصور" پر ہی پہونچ گئے جہاں دوسرے مفسرین پہلے ہی پہونچ چکے تھے ۔ چنانچہ علامہ اپنے اسی زیر تبصرہ حاشیہ کے آخر میں یہ فرمانے پر مجبور ہو ہی گئے :-

" لہذا ایک عام ناظر کیلئے کچھ ضروری نہیں کہ وہ انکی تحقیق میں سرگرداں ہو"

اگر علامہ اپنی لاجواب تحقیق (جسکی ایک بات بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی) سے دستبردار ہو کر ابتداءً ہی یہ فیصلہ سنا دیتے تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن علامہ نے بھی تو تحقیق اور ریسرچ کی انتہا فرما دی کہ " یہ مقطعات پہلے عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے تھے کلام جاہلیت کے محفوظ نمونوں میں انکی مثالیں اب بھی موجود ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن بعد میں یہ اسلوب متروک ہو گیا جسکی وجہ سے مفسرین کیلئے ان کے معانی کی تعیین دشوار ہو گئی "

علامہ کو تقلید سلف اور اتباع اکابر سے کیسی نفرت اور بیزاری ہے اسکا

Scanned with CamScanner

اندازہ ایسے ہی مقامات پر کچھ ہوتا ہے کہ موصوف مضحکہ خیز سے بڑھکر مضحکہ خیز بات تحقیق واجتہاد کے نام پر ارشاد فرما سکتے ہیں لیکن کسی معقول بات کے نتیجہ میں تقلید سلف اور اتباع اکابر کا داغ دھبہ اپنے دامن پر ہرگز نہ آنے دیں گے۔

ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

حروف مقطعات کے متعلق تحقیق کے ساتھ ساتھ احتیاط کامل کا پہلو بھی یہی اور صرف یہی ہے کہ ان کے معانی اور مفاہیم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے اسکے حقیقی معانی کی تفتیش وجستجو نہ کی جائے جیساکہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور جمہور صحابہ کرام اور علمائے محققین کی تصریحات اوپر نقل ہوئیں ایسی صورت میں موصوف کا دعویٰ (کہ "یہ الفاظ نزول قرآن کے دور میں بالعموم سمجھے جاتے تھے یہ کوئی "چیستاں" نہ تھے) صرف طبعزاد ہے جس کا کوئی بھی تعلق حقیقت اور واقعہ سے نہیں ہے، علامہ موصوف اپنے اس انوکھے دعوے کو قیامت تک ثابت نہیں فرما سکتے۔ علامہ موصوف کا یہ شوق اجتہاد اور ذوق عدم تقلید ہی ہے جس نے انھیں "خود رائی" کا مستقل مریض وشکار بنا دیا ہے اور اس تفسیر میں بھی ان سے جگہ جگہ ایسی ایسی انوکھی اور اچھوتی تحقیقات محفوظ کرادی ہیں جس نے موصوف کے "تفرد" اور "استبداد رائے" پر مہر لگادی ہے۔ ملاحظہ ہو ایک اور نمونہ:-

تفرد کی ایک اور مثال

علامہ موصوف تفہیم القرآن جلد ۲ ص ۲۰۶ کے تفسیری حاشیہ ۲

میں فرماتے ہیں:۔

"مفسرین نے بالعموم اسکے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل خیر سے افضل ہے جس میں شب قدر شمار نہ ہو۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے ــــــــ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی لیلۃ القدر خیر من العمل فی الف شہر (یعنی شب قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے) ــــــــ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک رات میں خیر و بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانہ میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا"

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

ناظرین کرام! علامہ کا یہ تفسیری حاشیہ بار بار بغور ملاحظہ فرما کر۔ خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ علامہ کی تفسیر دانی کیسی زبردست ہے ایک طرف خود ہی فرماتے ہیں کہ

"مفسرین نے بالعموم اسکے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل سے افضل سے جس میں شب قدر شمار نہ ہو"

اور یہ بھی اقرار و تسلیم فرما رہے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت

بیان کی ہے" ـــــــ حضورؐ نے فرمایا جو شخص شب قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کیلئے کھڑا رہا اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے جو شخص انکے اجر کے لئے عبادت میں کھڑا رہا اسکے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے" اللہ اسکے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیگا۔

اور دوسری طرف جملہ مفسرین کی اصلاح بلکہ خود حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خردہ گیری فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ

آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں ـــــــ اسلئے آیت کا مطلب (وہ نہیں ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مفسرین نے سمجھا ہے بلکہ) یہ ہے کہ اس رات میں خیر و بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانہ میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا"

مطلب یہ ہے کہ شب قدر ہر سال نہیں آتی

علامہ کا یہ حوصلہ قابل داد ہی کہا جائیگا کہ وہ دوسرے علماء کرام اور صحابۂ عظام پر تنقید فرماتے فرماتے خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خردہ گیری اور اصلاح فرمائی کی صریح ضلالت اور کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نعوذ باللہ من علم لا ینفع۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس حقیقت کی وضاحت میں پیش کی گئی کہ ناظرین کرام بھی پوری طرح باخبر ہو جائیں کہ علامہ مودودی کی یہ تفسیر جو تفہیم القرآن کے خوشنما نام سے شایع

Scanned with CamScanner

کیجا رہی ہے اور جسکی پبلسٹی میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ تفسیر قرآن فہمی کیلئے ہرگز نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اسکی آڑ میں تحریک مودودیت کی افہام و تفہیم اور اشاعت و تبلیغ ہی مقصود ہے

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ بقول علامہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سورۂ قدر کی مذکورہ بالا آیت پر پوری طرح غور نہ فرمایا کہ آیت کے الفاظ کیا ہیں اور میں شب قدر کی جو فضیلت بیان کر رہا ہوں وہ اس آیت سے نکلتی بھی ہے کہ نہیں۔ تو اس سے بڑھکر گمراہی اور کیا ہوسکتی ہے۔؟ اور تفہیم القرآن کا اصل مدعائے نگارش بھی یہی ہے کہ اسکے ذریعہ لوگوں میں اکابر و اسلاف صحابہ کرام حتی کہ خود حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لوگوں کو بدعقیدہ اور مبتلائے شک و ارتیاب کردیا جائے اور جب پوری طرح ذہن سازی ہوجائے تو اپنی دعوت و تحریک پر ایمان و تصدیق کا مطالبہ کیا جائے۔

علامہ موصوف کی اسی فنکاری کو "عالم آشکارا" کرنے کیلئے موصوف کی تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش کیجا رہی ہے اور یہ زیر نظر تبصرہ شروع کیا گیا ہے۔ صفحات گذشتہ میں علامہ کے دیباچہ و مقدمہ و تفسیری حاشیوں پر جو کچھ بھی تبصرہ کیا گیا ہے انکی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہوچکی ہے کہ علامہ کی تفہیم القرآن صرف مودودیت کی تفہیم و تبلیغ کیلئے لکھی گئی ہے جسمیں موصوف نے دیدہ و دانستہ صریح مفہومات قرآنی اور تفسیرات مفسرین کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے ذاتی اور طبعزاد خیالات و نظریات کو ناظرین تفہیم پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً مقطعات قرآنی کی بحث میں علامہ نے معتزلہ و متکلمین کے مسلک کی پیروی میں "مقطعات کو متشابہات" کا مصداق اور ناقابل فہم ماننے سے تو صاف صاف انکار ہی فرمادیا ہے اگرچہ سردست انکے کوئی معنی بھی متعین نہیں کئے ہیں، لیکن موصوف کی تشریح کے پیش نظر اسکا پورا پورا امکان ہے کہ اگر موصوف کو آئندہ کسی قلمی تفسیر میں ان مقطعات کے معنی کا کوئی سراغ لگ گیا جسطرح انھیں متشابہات مقطعات کے انداز پر کلام جاہلیت کے نمونے دستیاب ہوگئے ہیں تو موصوف ان مقطعات کے معانی کا بھی اعلان و انکشاف فرماسکتے ہیں کیونکہ موصوف انھیں بنیادی طور پر ناقابل فہم تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

راقم السطور نے جہاں تک تفسیر تفہیم القرآن اور تحریک مودودیت سے متعلق کچھ لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے اسکی روشنی میں پورے اطمینانِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکا ہے کہ تحریک مودودیت عام مسلمانوں کیلئے وقت کا زبردست فتنہ ہے اور اپنے بعض حضرات علماء کا انکی تنقید سے دستبرداری کیساتھ کیساتھ مظاہرۂ اتحاد و یگانگت یہ اسوقت کا دوسرا فتنہ ہے مودودیت کا موجودہ فروغ بڑی حد تک ایسے حضرات کے خاموش تعاون و اتحاد کا رہینِ منت ہے

تفہیم القرآن کے دیباچہ و مقدمہ پر اس تبصرہ کے درمیان یہ حقیقت بھی کھلکر سامنے آگئی ہے کہ تفہیم کی گمراہیاں اور فتنہ سامانیاں نہ تو ایسی معمولی ہیں کہ آسانی کیساتھ انسے صرف نظر کر لیا جائے اور نہ ہی ایسی تھوڑی ہیں جنھیں انگیز کر لیا جائے حقیر راقم السطور نے منصب افتاء سے وابستگی کے باوجود اس تبصرہ میں بھی ان گمراہیوں کی نشاندھی کی ہو اسکی روشنی میں کوئی فیصلہ و فتویٰ بعد کی چیز ہو ویسے بہت سارے علماء کرام اب سے بہت پہلے ہی متعدد فتاویٰ صادر فرما چکے ہیں لیکن دوسرے بہت سے حضرات کو کسی حد تک کچھ تردد باقی تھا اسلئے یہ ضرورت بہرحال باقی تھی کہ "تحریک مودودیت" کی بنیادی کتاب "تفہیم القرآن" پر مکمل و مبسوط تبصرہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ علامہ کی "تفہیم کو سمجھنے کی کوشش" جو کیجارہی ہے اسکے نتیجہ میں "تبصرہ کی پہلی جلد" اختتام پذیر ہو رہی ہے۔

ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ علامہ موصوف نے اپنے دیباچہ تفہیم میں اپنی آزاد ترجمانی کی کیسی کیسی قصیدہ خوانی فرما کر دوسرے تراجم و تفاسیر پر خط تنسیخ و بطلان کھینچا تھا اور کیسے حسین انداز میں اپنی تفسیر کیلئے مارکیٹ میں جگہ نکالنے کی ترکیب سوچی تھی۔ ناظرین کرام نے گذشتہ صفحات میں یہ بھی ملاحظہ فرما لیا کہ علامہ موصوف جو اپنے دیباچہ و مقدمہ میں بقلم خود اپنی آزاد ترجمانی و قرآن فہمی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے تفسیری حدود میں قدم رکھتے ہی "حروف مقطعات" کی تفسیر و تشریح میں کیسی کیسی قلابازیاں کھاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ "مسجودیت آدم" کی بحث میں کیسی صفائی سے جملہ مفسرین کی متفقہ تفسیر کو چھوڑ کر مسجودیت آدم کا صاف انکار فرما گئے اور قرآن مجید کی تفسیر میں تحریف معنوی کی کھلی جرأت کر بیٹھے۔ "سورۂ قدر" کی تفسیر میں "شان مفسریت" نے جوش کیا تو تمام مفسرین کی تغلیط فرما ڈالی بلکہ اور ترقی کرتے ہوئے خود

Scanned with CamScanner

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خردہ گیری اور اصلاح فرمانی کی جسارت کر بیٹھے کہ شب قدر سے متعلق جو حدیثیں آپ نے ارشاد فرمائیں اور اسکا جو مفہوم آپ نے متعین فرمایا اور تمام مفسرین نے اسکو اپنی اپنی تفسیروں میں بنیاد قرار دیا وہ مفہوم قرآن کے الفاظ سے مفہوم ہی نہیں ہوتا یعنی قرآن کے مخاطب اصلی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تو نعوذ باللہ منہ "قرآن فہمی" میں غلطی فرما سکتے ہیں مگر چودھویں صدی کا یہ مفسر اعظم غلطی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

معوذتین کی بحث میں علامہ کا یہ ارشاد موصوف کی شانِ علم کا اندازہ کرنے اور انکے ذہنی حلقہ بگوشوں کی آنکھیں کھولنے کیلئے بہت کافی ہے کہ ان سورتوں میں صرف ایک آیت ہے جس کا ظاہری تعلق مضمون سحر سے ہے بقیہ آیات سحر سے تعلق نہیں رکھتیں (اسلئے معوذتین کو واقعۂ سحر سے متعلق سمجھنا کوئی معقول بات نہ ہوگی)۔ ایسے ہی مواقع پر غالب کا یہ مشہور شعر تھوڑی ترمیم کے ساتھ بار بار حاشیۂ خیال سے ٹکرا جاتا ہے ؎

ہر کم نظر کو دعوئے تفسیر الاماں ۔۔۔ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

معروضات سابقہ کو مختصراً دوبارہ صرف اسلئے دہرایا گیا کہ علامہ کی مفسرانہ کاوشوں کا کچھ نمونہ سامنے آجائے۔

بعونہ تعالیٰ جلد اول تمام ہوئی مکمل "تفہیم القرآن" پر بالاستیعاب تبصرہ کیلئے جلد دوم کا انتظار فرمائیں جس میں پوری تفصیل سے پوری تفسیر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

آخر میں دعا رہے کہ اللہ تعالیٰ "تبصرۂ تفہیم" کی اس حقیر کوشش کو عام مسلمانوں کیلئے باعث نفع و ہدایت اور احقر راقم السطور کے لئے ذریعہ نجات و ذخیرۂ آخرت بنائے ۔ آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

عبد القدوس رومی۔ آگرہ

مکتبۂ صہیب برادران

کی

مطبوعات

مناجاتِ مقبول (سراجی)

معمولاتِ نبویؐ

نظم المفتی (تسہیل و تفہیم رسم المفتی منظوم اردو)

اکسرے رپورٹ (اول، دوم)

ایک آئینہ میں تین چہرے

مودودیت بے نقاب

تین خطرے

اسلامی حکومت کی کہانی علامہ خمینی کی زبانی

حقیقت کی روشنی

تصویر کا دوسرا رخ

مہربانوں کے خط

عید میلاد النبیؐ کی تقریبات

تفہیم القرآن سمجھنے کی کوشش {اول (نیا ایڈیشن زیر طبع)، دوم، سوم}

دیوبند سے بریلی تک

حیات اعلحضرت کے چند پہلو (مختصر کتابچہ)

مکتبۂ صہیب برادران

"غریب خانہ" ۲/۹۹۲ـ تلسی پور، وصی آباد، الہ آباد ـ ۲۱۱۰۰۳